KitaabPoint.blogspot.com

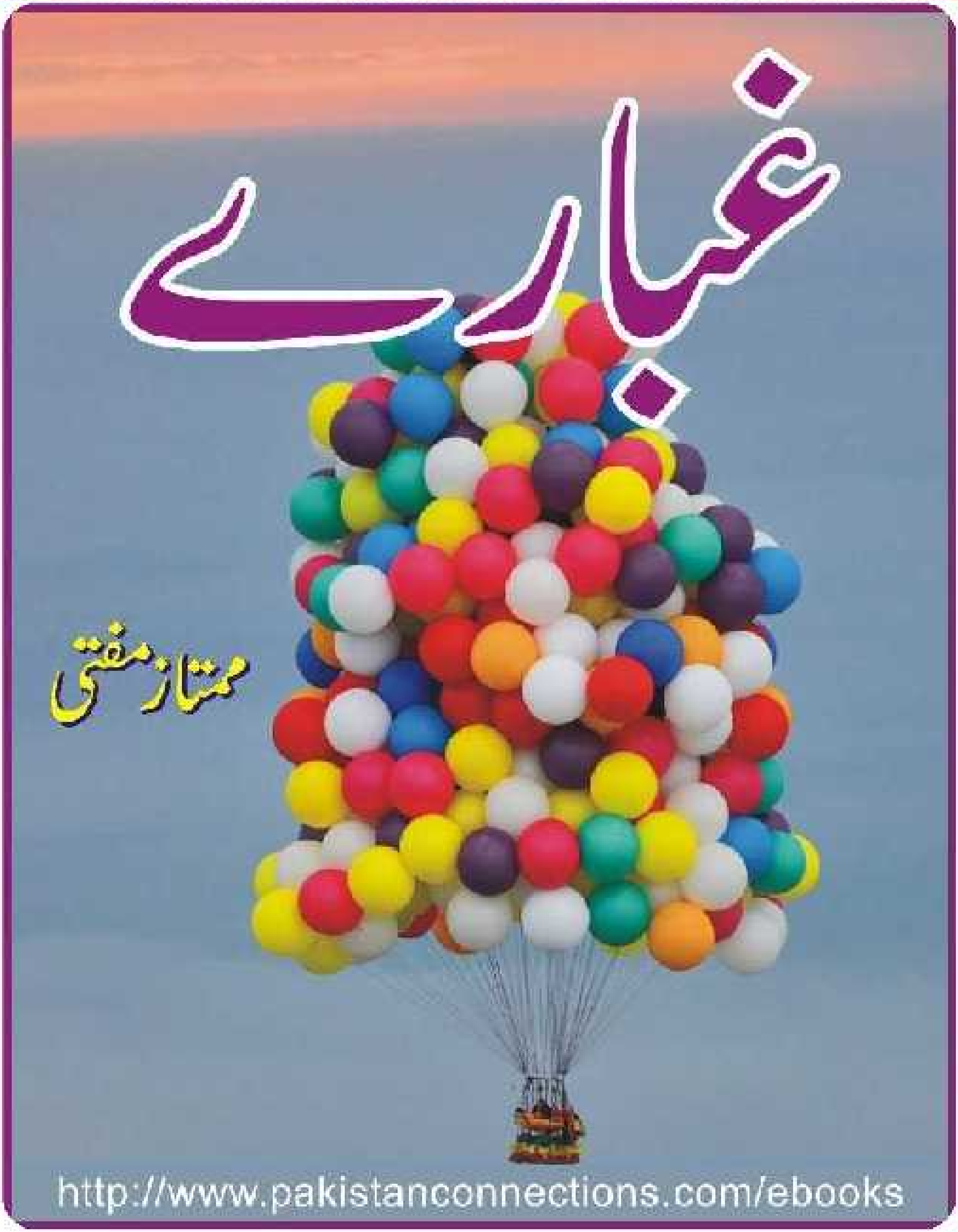

KitaabPoint.blogspot.com

غبارے

طنز و مزاح

ممتاز مفتی

KitaabPoint.blogspot.com

صریر خامہ

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ افسانہ نگاری (تصنیف) کو روحانی تاثیر یا الہامی وجدان سے تعلق ہے۔ درآمد کے بغیر عمل تصنیف ممکن نہیں۔ شاعری کے متعلق ممکن ہے یہ بات درست ہو کیونکہ مجھے شاعری کا کوئی تجربہ نہیں۔ لیکن جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں یہ محض خوش فہمی ہے افسانہ نگاری کو آمد سے کوئی تعلق نہیں۔

افسانہ نگاری درحقیقت ایک دستکاری ہے اور افسانہ نگار کو خام مواد پر ایسے ہی محنت کرنا پڑتی ہے جیسے ٹھٹھار کو برتن بنانے میں یا جیسے کھلونے بنانے والے کو کھلونے بنانے میں۔ یہ تو ہوا تصنیف کا ایک پہلو دوسرے پہلو سے نگاہ ڈالی جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ افسانہ نگاری ایک ایسا مشغلہ ہے جس میں آمد کا محتاج نہیں ہونا پڑتا اور وجدانی کیفیت بھی ان حصوں میں نہیں۔ جب جی چاہے قلم اٹھایا اور اللہ کا نام لے کر لکھنا شروع کر دیا۔

قدیم افسانہ نگاروں نے تو اپنی تصانیف میں اس امر کا عملی ثبوت تک پیش کر دیا ہے۔ کوئی پرانی تصنیف اٹھا کر دیکھ لیجئے مصنف نے ابتدا میں بسم اللہ الرحمن الرحیم تک مضمون میں شامل کر رکھا ہے۔

البتہ ہر مصنف عالم تصنیف کے دوران میں چند مخصوص تفاصیل کا خیال رکھتا ہے کیونکہ وہ لکھنے کے عمل میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں اور یہ تفاصیل طبیعت کے مطابق بناتا ہے یا وہ عادت کی وجہ سے عالم وجود میں آتی ہیں اور پھر اس قدر ضرور اور اہم ہو جاتی ہیں کہ ان کے بغیر تصنیف کا عمل یوں بے کار ہو کر رہ جاتا ہے جیسے سیاہی کے بغیر قلم' مثلاً میرے ایک دوست افسانہ لکھنے سے پہلے بہترین کاغذ مہیا کرتے ہیں چار ایک قیمتی پنسلیں خریدتے ہیں جو نہ تو بہت سافٹ ہوں اور نہ ہارڈ۔ ان پنسلوں کو نہایت صفائی سے بناتے ہیں اور پھر میز پر ایک خصوصی انداز سے پنسلیں رکھ لیتے ہیں اور خوبصورت کاغذ سامنے پھیلا لیتے ہیں اس کے بعد ان پر لکھنے کا موڈ طاری ہوتا جاتا ہے اور کبھی کبھی اس قدر شدت سے طاری ہوتا ہے کہ پھر اللہ کا نام لینا بھی ضروری نہیں رہتا۔ ایک اور دوست ہیں جو ڈرامہ نویسی کا شغل فرماتے ہیں ان کی تفاصیل قطعی طور پر مختلف ہیں۔ انہیں پنسل اور کاغذ کی نوعیت سے چنداں دلچسپی نہیں۔ موڈ طاری کرنے کے لیے ان پر لازم ہوتا ہے کہ وہ کمرے میں مسلسل طور پر یوں چکر کاٹیں جیسے پنجرے میں شیر کمرے میں چکر کاٹتے کاٹتے وہ زیر لب گنگنانے لگتے ہیں یہ گنگناہٹ آہستہ آہستہ بلند ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ اس میں ڈرامائی عنصر پیدا ہو جاتا ہے اور پھر مکالموں کی آمد

KitaabPoint.blogspot.com

شروع ہوجاتی ہے "مابدولت تمہیں اجازت دیتے ہیں" پھر وہ میز کی طرف بھاگتے ہیں اور جملہ لکھ کر پھر سے گھومنا شروع کر دیتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کا ڈرامائی انداز اور ڈرامائی ہوجاتا ہے پھر وہ میز سے پنسل کاغذ اٹھا کر ہاتھ میں تھام لیتے ہیں اور ہر لائن کی آمد پر ساتھ اسے لکھتے جاتے ہیں۔

ان کے اس طرز عمل کا یہ فائدہ ہے کہ جب وہ ڈراما لکھ رہے ہوں تو محلے والوں کو بن بتائے معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ عمل تصنیف میں مصروف ہیں۔ لیکن اس انداز تصنیف میں چند عیب بھی ہیں مثلاً ایک مرتبہ جب وہ کسی دوست کے ہاں مقیم تھے اور ان پر ڈراما وارد ہوا تو دوست کے بیوی بچے اس قدر ڈر گئے کہ انہوں نے پڑوسیوں کو بلوا بھیجا و نتیجتہً ایک ہنگامہ بر پا ہوگیا۔

پچھلے سال مری میں مجھے ایک ایسے صاحب تصنیف کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا جن پر ایک خوبصورت اور خوش کن خواب دیکھنے کے بعد تصنیف کرنا لازم ہوجاتا تھا۔ صرف یہی نہیں خواب دیکھنے کے بعد وہ جاگ اٹھتے۔ اب تصنیف کے عمل کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے ان پر لازم ہوتا تھا کہ وہ لحاف سے باہر نکل کر کرسی میں بیٹھ کر لکھیں۔ ایک رات تین بجے کے قریب میں بیدار ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ کرسی میں بیٹھے سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں اس روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ خوبصورت اور خوش کن خواب دیکھنا اور لحاظ سے نکل کر کرسی پر کپڑا لیے بغیر بیٹھنا ان کی انفرادی تصنیفی تفاصیل ہیں۔

شکر ہے موسم سرما میں انہوں نے چار ایک بار سے زیادہ مرتبہ خوبصورت خواب نہ دیکھا ورنہ مری کی فرقوں میں رات کے وقت ڈاکٹر کو بلا کر لانا کوئی آسان کام نہیں۔ چند ایک صاحبان تصنیف ایسے ہیں جنہیں عمل تصنیف کے وقت مکمل خاموشی کی ضرورت پڑتی ہے حتیٰ کہ وہ گھڑی کی ٹک ٹک تک برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا انہیں گھڑی کو بند کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ عمل تصنیف میں حارج نہ ہو۔ کئی اصحاب گھڑی کی ٹک ٹک کے بغیر لکھ نہیں سکتے۔ اس لئے انہیں تصنیفی موڈ کو برقرار رکھنے کے لیے ہر وقت ساتھ ٹائم پیس رکھنی پڑتی ہے۔

مختصر افسانے میں سب سے زیادہ ضروری چیز وہ مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے ارد گرد افسانے کا پلاٹ گھومتا ہے۔ افسانہ نگار کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز یہی مرکزی خیال ہوتا ہے اسے قائم کئے بغیر افسانے کا پلاٹ کی تفصیلات سوچنا ممکن نہیں۔ یہ مرکزی خیال چاہے کوئی فلسفیانہ اقتصادی تمدنی یا نفسیاتی حقیقت ہو یا زندگی سے کوئی جیتا جاگتا کردار یا کوئی دلچسپ صورت حالات۔ بہر صورت اس کا قیام ضروری ہوتا ہے۔ ہر افسانہ نگار کے لیے تحریک افسانہ مختلف ہوتی ہے۔

کسی افسانہ نویس کے لیے ایک موہوم تبسم زیر لبی افسانہ کے لیے محرک ہوجاتا ہے اور وہ مرکزی خیال کو جانے یا سمجھے بغیر تصنیف

KitaabPoint.blogspot.com

کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کوئی کسی کردار کے ایک پہلو سے متاثر ہو کر لکھتا ہے اور کسی کے لیے یہ لازم ہوتا ہے کہ پہلے مرکزی خیال کو شعوری طور پر سوچے اور پھر بنیادی تفصیلات کو اس کے مطابق تعین کرے اور لکھنے کے دوران میں ان تفصیلات اور جذبات کو شدت سے محسوس کرے جنہیں وہ پیش کر رہا ہے میرا ایک دوست افسانہ نویس فطری طور پر کردار نویسی کی بے انداز صلاحیت رکھتا ہے کسی کردار کی کوئی ایک خصوصیت کے علاوہ اس کی یادداشت ہوتی ہے اس لئے وہ کردار خلا سے نکل کر بنفس نفیس اس کے سامنے آ بیٹھتا ہے اور اس سے باتیں کرنے لگتا ہے ایک روز اسے سوچ میں کھوئے ہوئے دیکھ کر میں نے پوچھا کیوں بھئی یہ خاموشی کیوں؟ کہنے لگا سخت تنگ آ گیا ہوں۔ کام کرنے کو جی نہیں چاہتا مگر وہ بے حد تنگ کرتی ہے۔

''وہ کون؟'' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا میں اسے فی الحال منی کہا کرتا ہوں۔ وہ خواہ مخواہ آ کر مجھ سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ مغز چاٹ لیتی ہے۔ پھر ایک روز میں نے دیکھا کہ وہ بازار میں کھڑا کباب کھا رہا ہے۔ میں نے کہا کہو بھئی یہ کیا بدتمیزی ہے یہاں کھڑے کباب کھا رہے ہو۔

کہنے لگا' وہ بھی یہی کہتی تھی۔ ''کون؟'' میں نے پوچھا۔

بولا ''وہی منی ابھی یہاں کھڑی تھی اس جگہ یوں دونوں بازوؤں سے سینہ بھینچے مسکرا رہی تھی اور انکھیوں سے دیکھ رہی تھی مجھے جیسے میں کوئی مجرم ہوں پگلی۔ اس لڑکی سے پوچھا چھڑانے کے لیے آج میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ لکھ دوں گا۔''

میں نے چڑ کر پوچھا' مگر وہ ہے کون؟ کہنے لگا'' بھئی اپنی منی' جو کہانی میں لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں اس کی ہیروئن' بڑی گھمبیر لڑکی ہے توبہ۔''

حال ہی میں میں نے ایک کہانی لکھ کر اسے بھیجی۔ کیونکہ وہ کسی پبلشر سے وعدہ کر چکا تھا کہ میری ایک کہانی غیر مطبوعہ اسے مہیا کر دے گا۔ اس کہانی کی ہیروئن سارہ کو ہائے اللہ کہنے کی عادت تھی۔ اس لئے میں نے اس کہانی کا نام ''ہائے اللہ'' ہی رکھا تھا۔ چار ایک دن کے بعد اس کی چھٹی آئی۔ لکھا تھا' کہانی موصول ہوئی شکریہ۔ میں نے اس کا نام بدل کر اوئی اللہ کر دیا ہے۔ اس پر مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے فوراً خط لکھا اور شکایت کی کہ اس نے کہانی کا نام کیوں بدلا۔ جواب میں اس نے مجھے ایک مختصر خط لکھا لکھا تھا' بھائی میں نے کہانی پڑھی ہے میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے' ہائے اللہ نہیں کہتی وہ تو اوئی اللہ کہتی ہے' پنجابن ہے نا۔ پھر تم اس کا نام ہائے اللہ کیسے رکھ سکتے ہو۔ عجیب آدمی ہو۔

میرے لئے مرکزی خیال بے حد اہم ہے۔ یہاں تک کہ مرکزی خیال کو سوچنے کے بغیر میں افسانہ لکھنے کی جرات ہی نہیں کر سکتا

KitaabPoint.blogspot.com

اور مرکزی خیال قائم کرنے کے بعد کہانی کی بنیادی تفصیلات کو مجھے شعوری طور پر سوچنا پڑتا ہے۔ یہ تفصیلات چار ایک سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ لیکن خاصی محنت کی طالب ہوتی ہیں۔ میرے افسانوں میں محسوسات کی نسبت سوچ بچار کا عنصر حاوی رہتا ہے۔ میرے افسانے سوچتے زیادہ ہیں اور محسوس کم کرتے ہیں۔ اگرچہ ذیلی تفصیلات میں محسوسات کا عنصر کافی ہوتا ہے لیکن مرکزی خیال ہمیشہ حاوی رہتا ہے۔ اس لئے افسانہ لکھنے میں میری سب سے بڑی مشکل ایک ایسا مرکزی خیال ہے جسے کرداروں کے برتاؤ میں سمویا جاسکے۔

مرکزی خیال تو کئی ایک سوجھتے ہیں اور ایسے مرکزی خیال بھی ذہن میں آتے ہیں جن پر افسانہ لکھنا آسانی سے ممکن ہوتا ہے اور جن پر افسانہ لکھنے کو شدت سے جی چاہتا ہے۔ مگر ضروری نہیں کہ یہ شدت بذات خود کبھی ایسی تحریک بن جائے جو عملی طور پر افسانہ لکھنے پر مجبور کردے۔ مرکزی خیال کا سوجھنا میرے لئے ایک عام سی بات ہے۔ بات سوجھتی ہے پانچ ایک منٹ کے لیے دماغی طور پر ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ختم ہوجاتی ہے۔

مثلاً چند ایک دن ہوئے کہ ازراہ اتفاق دور سے مجھے ایک عام برلب بام محبت کا منظر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ہیروئن عنوان شباب کے تقاضوں سے مجبور اپنی نمائش کررہی تھی اور ہیرو یہ سمجھ رہا تھا کہ اسے خصوصی طور پر نوازا جارہا ہے۔ مرکزی خیال اچھا تھا' موضوع رنگین تھا۔ چار ایک لمحات موضوع کی رنگینی سے منور رہے اور بس۔

ایک انگریزی ناول کا مطالعہ کرنے کے دوران میں دفعتاً چونکا محبوبہ بار بار کہہ رہی تھی پیارے مجھے سمجھنے کی کوشش کرو دفعتاً خیال آیا کہ اگر محبوبہ کو شدت سے محسوس کرنے کی جگہ خدانخواستہ ہیرو نے اسے سمجھنا شروع کردیا تو محفل ٹھنڈی پڑ جائے گی کیونکہ اس احرام کی دلچسپی ابرار سے وابستہ ہے۔ اتفاق سے فرصت تھی سوچا چلو اس مرکزی خیال پر ایک افسانہ لکھ دو۔ لیکن بار بار سوچنے کے باوجود وہ بنیادی تفصیلات پیدا نہ ہوسکا جو اس حقیقت کی مظہر ہوسکیں۔

عام طور پر افسانہ لکھنے پر صرف ایک وقت مجبور محسوس ہوتا ہوں جب مجھے جھلد بازی میں کیا ہوا وعدہ پورا کرنا ہوتا ہے۔ یا جب مطالعہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ انکار کرنا میرے لئے ممکن نہیں رہتا۔ ایسی صورت میں میں ان مرکزی خیالوں کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہوں جو مجھے اس دوران میں سوجھتے رہے تھے۔ اگر کوئی مناسب مرکزی خیال ذہن میں آجائے اور میں فیصلہ کرلوں کہ اسی پر افسانہ لکھوں گا تو مجھ پر لازم ہوجاتا ہے کہ اس مرکزی خیال کو ذہن میں قائم کرکے چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے اس پر سوچتا رہوں۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ بنیادی کوائف قائم کئے جائیں۔ کوائف قائم کرنے کے لیے یکسوئی سے بیٹھ کر سوچنا میرے لئے ممکن نہیں اس سلسلے میں میرے لئے یکسوئی سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہے کہ میرا شعوری نفس کام چور واقع ہوا ہے اس

KitaabPoint.blogspot.com

لئے وہ اپنا کام نفس غیر شاعر کے سپرد کر کے خود احساس فراغت حاصل کرنے کا خواہشمند ہے لیکن اس عرصہ کے دوران میں جب کہ میرا نفس غیر شاعر کسی ایسے کام میں لگا ہو میں شعوری طور پر کسی ایسے کام میں منہمک نہیں ہو سکتا جو میری تمام تر ترجہ کا طالب ہو۔ احساس فراغت سے میں اٹھتا بیٹھتا چلتا پھرتا' روتا' ہنستا رہتا ہوں اور نفس غیر شاعر سوچتا رہتا ہے اس دوران میں کبھی کبھی دفعتاً ایک دھچکا سا لگتا ہے اور میں چونکتا ہوں اور ہورد ھچکے سے افسانے کا ایک بنیادی نکتہ حل شدہ صورت میں یوں لاشعور سے ذہن میں ٹپک پڑتا ہے جیسے درخت سے پکا ہوا آدم۔ اس طرح دو ایک دن میں جب افسانے کے تمام نکات قائم ہو جاتے ہیں تو میں یہ بات طے کرتا ہوں کہ افسانہ گو کون ہو؟ اور ابتدا میں افسانہ کس مقام سے شروع ہو اور کس مقام پر فلیش بیک شروع ہو جائے۔ عام طور پر افسانے میں فلیش بیک ضرور لاتا ہوں۔ شاید اس لئے کہ میرا خیال ہے کہ لوگ ماضی کے بعد زیادہ حال میں دلچسپی لیتے ہیں۔

اس لئے میں آج کی بات سنا کر قاری کے دل میں ان کرداروں یا حالات کے متعلق دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور جب یہ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے تو بات کو ابتدا سے شروع کر مناسب سمجھتا ہوں۔

یہ سب باتیں طے کرنے کے بعد میں اٹھتے ب بیٹھتے چلتے پھرتے کہانی بننا شروع کر دیتا ہوں۔

کہانی بننے کا یہ عمل میرے لئے بے حد ضروری ہے اگر چہ یہ عمل میں یکسوئی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یعنی میں بیٹھ کر پوری توجہ سے اسے بن نہیں سکتا۔

عام طور پر سائیکل چلاتے ہوئے یا روٹین کام کرتے ہوئے یہ بننے کا عمل خوب چلتا ہے۔

افسانہ بننے کا یہ عمل دلچسپ تو ہوتا ہے لیکن اس میں دکھ کا عنصر بے حد پریشان کن ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر حال ہی میں جب میں اپنے ایک افسانے ''اوئی اللہ'' کو بن رہا تھا جس کی ہیروئن اینٹوں کی جالی کے پیچھے دکھائی دیتی ہے جس کی آنکھیں کشتیوں کی طرح ڈولتی تھیں۔ لٹ بار بار گرتی تھی اور وہ بات بات پر اوئی اللہ کہنے کی عادی تھی۔ تو یہ شدت سے محسوس کر کے اسے خودنمائی کا موقعہ بھی میسر نہیں جو ایک ضروری نسائی تقاضہ مجھے اس قدر دکھ محسوس ہوا کہ کہانی بننا میرے لئے مشکل ہو گیا اور بہانے بہانے میں نے کئی ایک دن کے لیے بات پس پشت ڈال رکھی۔

دوسری مرتبہ جب میں نے از سر نو اسے بننا شروع کیا تو لب بام محبت کی رنگینی کے شدید احساس کی گرفت میں آ گیا اور جی چاہا کہ افسانہ نویسی کو ترک کر کے افسانہ بننے کا مشغلہ شروع کر دوں۔

کئی ایک بار ایسا بھی ہوا ہے کہ افسانے کے کسی کردار کا شدید دکھ محسوس کر کے میں نے ضبط کھو دیا اور افسانہ ہمیشہ کے لیے نامکمل

KitaabPoint.blogspot.com

رہ گیا۔

افسانہ نویس کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اسے خواہ مخواہ کا غم کھانا پڑتا ہے اور وہ ہر نیا افسانہ لکھنے کے بعد پانچ یا دس سال اور بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غم زندگی پر حاوی ہے۔ اگر افسانہ نویس غم سے بے نیاز ہو جائے یا اس پر ہنسنے لگے تو اس کے افسانوں میں تمسخر کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے اور میرے نزدیک ادب کی سب سے بڑی خصوصیت لوگوں کے دل میں کرداروں سے ہمدردی پیدا کرنا ہے' نفرت' غصہ یا تمسخر نہیں۔

بدقسمتی سے ایک مرتبہ مجھے "وہ ہاتھ" کے عنوان سے ایک افسانہ لکھنا پڑا۔ اس افسانے کا کچھ حصہ میرے ایک دوست آرٹسٹ کی سرسری آپ بیتی تھی۔

اس نے مجھے وہ جالی دار کھڑکی دکھائی جس میں دو حسین ہاتھ ابھرا کرتے تھے۔ وہ پرنالہ دکھایا جس سے ٹپ ٹپ بوندیں گرتی تھیں۔ اس واقعہ میں اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے افسانہ بننا شروع کر دیا۔ چند ایک دنوں میں میں نے محسوس کیا کہ میں دیوانہ وار لوگوں کے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا ہوں اور بظاہر گونگے ہاتھ چلا رہے ہیں۔ گنگنا رہے ہیں۔ سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ بلا رہے ہیں دامن کش نظر ہیں۔ دامن جھٹک رہے ہیں۔ چپ ہیں۔ اس پر میں خائف ہو گیا کہ کہیں میں دست پرست نہ ہو جاؤں۔ کل کو چھوڑ کر جزو پرستی میں نہ کھو جاؤں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے ڈر کے مارے جلدی جلدی وہ افسانہ مکمل کر کے اپنی جان چھڑائی۔

میرے افسانہ لکھنے کے کوائف بالکل عام سے ہیں۔

افسانہ بنتے بنتے جب جذبات اس قدر شدید ہو جاتے ہیں کہ مزید برداشت نہیں کر سکتا تو دل ہلکا کرنے کے لیے لکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

کوئی پنسل ہو کوئی کاغذ ہو چاہے کوئی ڈھول بجائے' بچے شور مچائیں۔ بیگم شکایت کا دفتر کھول دے۔ کوئی چیز میرے کام میں حائل نہیں ہو سکتی۔ البتہ میں کرسی پر بیٹھ کر نہیں لکھ سکتا۔ لکھنے کے لیے چارپائی پر ایک پہلو پر نیم لیٹنے' نیم بیٹھنے کی تفصیل بے حد ضروری ہے۔ آپ مجھ پر عائد کر دیں کہ بیٹھ کر لکھو یا ٹانگیں پھیلا کر رکھو۔ نہ صاحب افسانہ کبھی نہ لکھا جائے گا' ٹانگیں چاقو کی طرح ہوں گی۔ بائیں ہاتھ سے سر سنبھالا ہوا ہو تو افسانہ مکمل ہو کر رہے گا۔ چاہے باقی حالات کیسے ہی ہوں لکھنے کے دوران میں باتیں کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بیگم کے طعنوں کا جواب بھی دیا جا سکتا ہے مگر غصہ محسوس کرنا ممنوع ہے ورنہ افسانہ ختم ہو جائے گا اور بیگم کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ افسانہ لکھنے کے دوران میں وہ جو جی چاہے کر سکتی ہے پرانے شکوے دھرا سکتی ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

ہاں اگر پس منظر میں ریڈیو پر موسیقی ہو رہی ہو تو وہ میرے لئے افسانہ نویسی میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اگر موسیقی ختم ہو جائے اور بات چیت یا خبریں شروع ہو جائیں تو دفعتاً ہاتھ رک جاتا ہے اور پھر میں لپک کر ریڈیو کی طرف بھاگتا ہوں اور دیوانہ وار سوئی گھماتا ہوں، موسیقی، موسیقی!!

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

پڑھانا

مجھے پڑھانے کا شوق ہے۔جی چاہتا ہے کہ ہر وقت کسی نہ کسی کو کچھ نہ کچھ پڑھاتا رہوں۔لیکن کوئی بھی پڑھنے کا شائق نہیں۔بڑی مصیبت ہے۔مثلاً آپ مجھے بازار میں ملتے ہیں اور اخلاقاً مزاج پوچھتے ہیں کسی اور صاحب سے پوچھتے آپ تو وہ کہتا ''شکر ہے مہربانی' جی رہا ہوں' یا مر رہا ہوں بیمار ہوں' بہر حال ان سب میں چنداں فرق نہیں۔یہ جواب سن کر آپ کو اطمینان ہو جاتا ہے اور ہمدردی جتانے کے لیے آپ کہتے ہیں''خدا فضل کرے''''بڑی خوشی ہوئی یہ سن کر' اور چل دیتے ہیں۔لیکن چونکہ مجھے پڑھانے کا شوق ہے میں ایک نئی بات پیدا کرونگا۔شاید میں کہوں''جی ضرورت سے زیادہ اچھے ہیں'' یہ سن کر آپ چونک کر میری طرف یوں دیکھیں گے گویا تحقیق کر رہے ہوں کہ پاگل خانے سے آیا ہوا تو نہیں۔اس وقت میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو توقعات' ضرورت اور مزاج پرسی کے متعلق ایک دم سب کچھ پڑھادوں...... ہاں تو میں''دو جینز'' سے ابتدا کرونگا اور رنگینی کی چاشنی کے لیے وہ شعر کہہ دوں گا''اپنی توقعات کا گھونسلا اس قدر اونچا نہ بنایئے جہاں سے مزاج کی دنیا اندھی یا گری گری دکھائی دے۔دو ایک باتیں تو سن لیں گے آپ اور شاید مسکرا بھی دیں لیکن جلد ہی اتنا لمبا ہاتھ نکال زبردستی مصافحہ کرتے ہوئے کہیں گے۔''اچھا تو بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر' اور اپنی راہ میں حیران کھڑا کا کھڑا رہ جاؤنگا۔حلق میں بدھ کا نروان اور کنفیوشس کا تشکر کانٹا کر رہ جائیں گے۔

دراصل یہ پڑھانے کی عادت مجھے ورثہ میں ملی ہے اور میں پیدائشی استاد ہوں۔یہ اللہ کی دین ہے محنت کرنے سے حاصل نہیں ہوتی۔آپ ٹریننگ لے کر سکول ماسٹر بن سکتے ہیں استاد نہیں چونکہ استاد پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاسکتا۔

اللہ کے فضل سے ہمارے گھر کے سبھی افراد پڑھانے کا شوق رکھتے ہیں۔کوئی ہمارے گھر چلا آئے چچی فوراً اٹھ کر پاس جا بیٹھے گی۔اخلاق اور خلوص ختم ہے اس پر۔پھر یہ بتانا شروع کر دے گی کہ پڑوسن نے کیا پکایا ہے۔اس کے میاں کو دہی بڑوں سے کیوں رغبت ہے اور دہی بڑوں میں کس مقدار میں ہونا چاہیے اور بڑے کس مقدار میں۔دہی بڑے کھانے سے کونسی بیماری لاحق ہو جاتی ہے اور اس کے اپنے بھتیجے کو افسانہ نویسی کی شکایت ہے اور افسانہ اسے کہتے ہیں جس کا نہ منہ نہ سر۔البتہ سر میں درد پیدا کر دے۔یعنی کسی خاتون کو عام چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہو تو صرف ایک بار چچی کے پاس آ بیٹھے۔

شاید کوئی صاحب کہیں کہ یہ تو باتیں کرنا ہے۔پڑھانا تو وہ ہوتا ہے جو سکول میں ہو۔آپ ایسے سمجھدار اصحاب سے ایسی باتوں کی

KitaabPoint.blogspot.com

توقع رکھنا تو حماقت ہوگی۔ کون نہیں جانتا کہ تعلیم وہ ہے جس میں شبہ بھی نہ پڑے کہ آپ کو پڑھایا جا رہا ہے یا گیا ہے اور سکول .... سکولوں میں تو بچے ہوتے ہیں۔ ڈائرکٹ ان ڈائرکٹ ہوتا ہے۔ ایلیس ہوتی ہے اور اگر ایک سیدھی لکیر دوسری پر آن کھڑی ہو تو دو زاویوں کا مجموعہ دو قائموں کے برابر ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ آپ وہاں جا بیٹھیں چاہے پڑھیں نہ پڑھیں آپ کو خواہ مخواہ احساس شروع ہو جائے گا کہ آپ پڑھ رہے ہیں۔ جبھی تو بچے سکول سے بھاگ بھاگ جاتے ہیں۔

سکول کے بارے میں میری معلومات بے حد وسیع ہیں یعنی میں سکول سے پورے طور پر واقف ہوں بلکہ اس حد تک کہ کسی اور چیز کو نہیں جانتا۔ چونکہ پہلے سکول میں پڑھتا اور اب سکول ماسٹری کرتا ہوں اور سکول ماسٹری کرنے سے فارغ ہو کر گھر آ کر سکول میں جاتا ہوں چونکہ اس وقت بھی پاس ہی میری بیوی کے بچے با آواز بلند پڑھ رہے ہوتے ہیں یا بیگم مجھے کچھ نہ کچھ پڑھانے یا سمجھانے کی کوشش میں لگی ہوتی ہے۔

مجھے بچوں سے بے حد محبت ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ یا تو آپ کسی سے محبت کر سکتے ہیں اور یا اسے پڑھا سکتے ہیں۔ بیک وقت پڑھانا اور محبت کرنا ممکن نہیں۔ البتہ جس سے آپ کو محبت ہو آپ اس سے پڑھ سکتے ہیں۔ جبھی تو صدیوں اکٹھا رہنے کے باوجود مرد آج تک عورت کو کچھ پڑھا نہیں سکا بلکہ جب بھی پڑھانے کے خیال سے بیٹھا پھر جو اٹھا تو ایک نہ ایک بات پڑھ کر ہی اٹھا اسی لئے یورپ میں پڑھانے کے لئے استاد کی جگہ استانیاں مقرر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم نسواں کا سوال آج تک حل نہیں ہو سکا کیا آپ نے تعلیم مرداں پر جواب مضمون دیکھا ہے کبھی؟ جب مردوں کو پڑھانے کے لیے قدرت نے ایک مخصوص مخلوق "جنس لطیف" بنائی ہو تو ان کا ان پڑھ رہ جانا کیسے ممکن ہو سکتا ہے پھر کسی سلجھے ہوئے مسئلہ پر جواب مضمون کیسا؟

ہاں تو مجھے بچوں سے محبت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کسی معصوم بچے کو پاس بٹھا کر اس کی بھولی بھالی باتیں سنتا ہوں۔ لیکن مجھے بچے سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ شاید شہر بھر کے بچوں پر یہ راز کھل چکا ہے کہ میں سکول ماسٹر ہوں....... اور سکوں....... سکول کی بات نہیں۔ اگر آپ عام لوگ ہوتے تو شاید میں اس نکتہ کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتا سکول میں بھی کچھ ہوتا ہے۔ ڈسک ہوتے ہیں' بنچیں ہوتی ہیں....... کمرے ہوتے ہیں' سکول ماسٹر ہوتے ہیں اور ان کے ماتھے پر تیوریاں ہوتی ہیں۔ لیکن بچے نہیں ہوتے جس طرح ایک آدمی آدمیوں کے گروہ سے قطعی مختلف مخلوق ہوتا ہے اسی طرح بچہ اور بچوں کے گروہ کو ایک دوسرے سے کوئی مناسبت نہیں۔

اکیلا آدمی ایک کمزور ناتواں مخلوق ہے اس میں انسانیت' خلوص' ہمدردی' ڈر' کمتری اور جھجک ایسی جملہ کمزوریاں پائی جاتی ہیں

KitaabPoint.blogspot.com

جو گروہ میں مفقود ہوتی ہیں۔ جبھی تو مجھے ان بھکاریوں پر غصہ آتا ہے جو چلتی گاڑی میں گروہ سے بھیک مانگنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہاں افراد بیٹھے ہیں۔ بیوقوف! کوئی نہ کوئی بول اٹھتا ہے۔ ''یہ آج کل کے بھک منگے' ہونہہ! .... سب کے دلوں میں یوں گونجتا ہے گویا وہ سب ایک جسم کے عضو ہوں .... اور آپ جو گروہ میں ہوتے ہوئے اپنے خیالات میں کھوئے بیٹھے تھے اور اس طرح اپنی انفرادیت کا تحفظ کر رہے تھے اور بھکاری کی صدا ان سنی کر جانے میں آپ کا ہاتھ جیب کی طرف بڑھ رہا تھا گروہ کی بات سن کر معارک جاتا ہے اور یوں نک ٹائی سنوارنے میں لگ جاتا ہے گویا صرف نکٹائی سنوارنے کے لیے اٹھایا گیا تھا۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے کفر میں ایمان کی بتی جلانا شرفا کے بس کی بات نہیں کیونکہ شرفا صرف شریف آدمی ہوتے ہیں پیغمبر نہیں۔ اس کے علاوہ آپ با اخلاق آدمی ہیں اور پڑوسیوں کا جی دکھانا آپ کا شیوہ نہیں اور پھر اپنے آپ کو ان داتا ظاہر کر کے اپنی بڑائی جتانا یقینی طور پر ناگوار ہے۔ اس لئے آپ پر لازم ہو گیا کہ بھکاری کو کچھ نہ دیں۔ اگر آپ نے دے دیا تو لوگ سمجھیں گے کہ آپ قطعی طور پر جاہل ہیں اور اتنا بھی نہیں جانتے کہ آج کل کے بھکاری' ہونہہ!

تاریخ شاہد ہے کہ انسان نے جتنے کارنمایاں کئے' لڑائیاں لڑیں' عوام کیلیء حقوق حاصل کئے فیکٹری ریفارم بل پاس کرائے ی وہ سب گروہ کی برکت سے تھا۔ ورنہ فرد بیچارہ .... فرد کے بارے میں جاننا ہو تو بادشاہ کی سوانح عمری پڑھ لو یا جا کر دیکھ لو محل میں منہ چھپائے نہ بیٹھا ہو تو کہنا۔ مانا کہ مرد نے کارہائے نمایاں کئے۔ لیکن وہ عورت کو زیر نہ کر سکا۔ اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ عورت نے مرد کو گروہ کی صورت میں کبھی پاس پھٹکنے نہیں دیا۔ مرد اس کے حضور میں فرد کی حیثیت سے جاتا ہے اور نتیجہ یہ کہ گھٹنے ٹیک دیتا ہے یا رو دیتا ہے۔ آہیں بھرنا اور پھر شعر کہنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اگرچہ مرد ہر جگہ اپنے حقوق حاصل کر چکا ہے' دارالعلوم میں فیکٹری میں اور کہاں نہیں لیکن گھر میں اسے کوئی ریفارم نہیں ملا۔

اسی طرح بچوں کا گروہ بچے سے قطعی مختلف ہوتا ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بچے سے بھولے پن کی خوشبو آتی ہے لیکن بچوں کے گروہ سے جو عام طور پر کلاس روم میں پایا جاتا ہے کئی ایک خوشبوئیں آتی ہیں مثلاً چاک' چنے' سیاہی اور بدہضمی کی۔

اکیلے بچے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کبھی شکایت نہیں کرتا۔ وہ آپ کے پاس آ کر نہ کہے گا' مجھے فضلو چھیڑتا ہے یا فیضو بری باتیں کہتا ہے بچہ یا تو کھلونوں میں دلچسپی لے گا اور یا آپ اور جو آپ کی شخصیت میں دلچسپی لے وہ کیا برا یا بداخلاق ہو سکتا ہے وہ آپ سے پوچھے گا جی آپ کی اوپر کی جیب میں جو رومال ٹنگا ہے اس کا فائدہ ٹائی اور رومال ایک رنگ کے کیوں ہوتے ہیں' پان کھانے سے کیا ہوتا ہے' سگریٹ کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے' کیسے پیارے سوالات ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

مصیبت یہ ہے کہ سکول ماسٹر اور بچے کے درمیان مینڈک اور کتے کا سا بیر ہوتا ہے ادھر سکول ماسٹر آیا ادھر بچہ رخصت ہو گیا۔ جھگڑا یہ ہے کہ میں شوقیہ استاد ہونے کے علاوہ کاروباری طور پر سکول ماسٹر بھی ہوں۔

جب میں دور سے سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ بچے ہنس کھیل رہے ہیں تو فطری محبت اور شوق سے ادھر کھنچ جاتا ہوں لیکن میرے پہنچنے پر معاوہ تیس بچے تیس بزرگ بن کر مجھے حیران کر دیتے ہیں۔ منہ پر متانت' آنکھوں میں سنجیدگی اور ماتھے پر شکن پیدا کر لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس قدر گھبرا جاتا ہوں کہ مجھے شبہ ہونے لگتا ہے کہ میں بذات خود بچہ ہوں اور محکمہ نے تیس سیانوں کا بورڈ اس لئے اکٹھا کیا ہے کہ میرے نفس کا تجزیہ کر کے رپورٹ مرتب کرے' اس خیال پر میرا جذبہ انتقام بھڑک اٹھتا ہے اور میں ان جانے میں انہیں پڑھانا شروع کر دیتا ہوں خدا کا شکر ہے کہ اس نے پڑھنا اور پڑھانا دو مختلف نعمتیں بنائی ہیں جو لازم و ملزوم نہیں یعنی یہ ضروری نہیں کہ کوئی استاد پڑھا بھی سکے۔ ورنہ اس وقت پڑھانے سے دل ٹھنڈا ہونا ناممکن ہو جائے گا۔ چونکہ اس وقت کوئی میرا بوٹ غور سے دیکھتا ہے اور اندازہ لگاتا ہے کہ کب خریدا ہوگا۔ کوئی کوٹ کے آستین پر پڑے ہوئے دھبے گنتا ہے اور کوئی ہونٹوں کا مطالعہ کرتا ہے کہ آیا بولتے ہوئے انہیں نکالتا ہوں یا چباتا ہوں۔ اس کے علاوہ پڑھانے کے دوران میں پوچھے گئے سوالات قطعی طور پر اس بات کے شاہد ہوتے ہیں کہ پڑھنے کا سوال ہی نہیں بلکہ پڑھانے والے کو پرکھا جا رہا ہے ایک بزرگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

کیوں جی' اونٹ انگلستان میں کیوں نہیں ہوتا؟'' یعنی خالص میٹا فزیکل مسئلہ۔ اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ آپ کیوں ہیں۔ یا آپ میں کیوں نہیں تو نہ جانے آپ کیا کریں۔ لیکن ہم سکول ماسٹر ٹھہرے اور اصولاً ہر سکول ماسٹر میٹا فزکس میں ایک خصوصی قابلیت رکھتا ہے۔ ہاں تو اس حیثیت سے میں ہر مشکل سے ملک سوال کا جواب دینے میں کمال رکھتا ہوں۔ جسے کوئی سمجھے نہ سمجھے مگر اسے یقین ہو جائے گا کہ بات سمجھا دی گئی ہے۔ مثلاً میں کہوں گا اس لئے کہ انگلستان میں پانی بکثرت ہوتا ہے لیکن اونٹ وہاں ہوتا ہے جہاں پانی بکثرت نہ ہو مثلاً صحرا میں وشت میں۔

''تو جناب غالب کے گھر میں تو ضرور ہوگا۔''

غالب کے گھر میں؟ میں حیران رہ جاتا ہوں۔

''جی اس نے جو لکھا ہے۔'' ''وشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا''

شاید ہو میں چلاتا ہوں۔ ہو تو پڑا ہو نہ ہو تو نہ سہی' کچھ پروا نہیں ہم نے غالب کے گھر کا جغرافیہ نہیں پڑھنا۔

''اچھا جی' گھر کا جغرافیہ بھی ہوتا ہے کیا؟''

KitaabPoint.blogspot.com

"جی ہمارے گھر کا جغرافیہ کہاں سے ملے گا۔"

پھر تو گویا بھڑوں کا چھتو بھنبھنانے لگتا ہے۔

جی ماسٹر جی آپ کے گھر کا جغرافیہ بھی ہے کیا۔

اے نہیں ماسٹر جی کے گھر کی تاریخ ہے تاریخ۔

جیک اور جن کی کہانی سچی ہے جی۔

اب بتایئے سچی کہوں تو جی نہیں مانتا' جھوٹی کہوں تو وہ تیس اصحاب جیک کے کارناموں میں دلچسپی لینا بند کر دیں گے پھر کیا ہوگا اس کے علاوہ ان کے دل میں میری قدر کیسے رہے گی جو جھوٹی کہانیاں پڑھاتا پھرتا ہے۔ ان سوالات کی نوعیت سے ظاہر ہے کہ وہ جاننے کے لیے نہیں پوچھتے بلکہ پرکھنے کے لیے لیکن میں نے بھی ان جانی باتیں پڑھانے میں ملکہ پیدا کر لیا ہے۔ (چونکہ میں ایک سکول ماسٹر ہوں) اگرچہ اس بات میں میں چچا کی برابری نہیں کر سکتا۔

جب میں ٹریننگ کالج میں تھا تو پروفیسر صاحب نے ایک ایسا لیکچر دیا کہ ہم سب محسوس کرنے لگے کہ سمندر دیکھے بنا خدا اور کائنات کے سے بسیط حقائق کو سمجھنا ممکن نہیں۔ لیکچر سن کر طلبہ نے فیصلہ کیا کہ کراچی چل کر سمندر دیکھا جائے اس سلسلے میں میں چچا سے روپیہ مانگنے کے لیے گیا۔ چچا اس وقت لیٹے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے بولے "کس لئے چاہیے روپیہ"؟ میں نے کہا جی سمندر دیکھنے کے لئے جانا ہے" اس بات پر وہ ہنسے پھر بولے "جی پانی' پانی ہی پانی" انہوں نے بھری ہوئی بالٹی کی طرف اشارہ کیا اور بولے ہاں پانی اور اس پانی میں کیا فرق ہے؟" میں نے کہا "جی یہ سفید اور پھیکا ہے اور وہ کالا اور نمکین" "خوب" وہ اٹھ بیٹھے۔ "کیا وہ ساکن ہوتا ہے" میں نے کہا "جی نہیں' اس میں لہریں اٹھتی ہیں دریا چلتے ہیں اور گرداب پڑتے ہیں" "ایک منٹ" کہہ کر وہ اندر چلے گئے اور جلد ہی دوات' رسہ' نمک اور پیالہ لے کر آ گئے" یہ دیکھو انہوں نے پیالہ میرے سامنے رکھ کر اسے پانی سے بھر دیا۔ اب اس میں تھوڑا سا نمک ڈال دیں' یوں اور تھوڑی سی سیاہی بس اتنی۔ اب اس پیالے کا پانی کالا اور نمکین ہے۔ اس پیالے میں غور سے دیکھو۔ غور سے اب اسے اپنے تخیل میں پھیلاؤ' یہ مکان یہ محلہ یہ شہر اس میں غرق کر دو اور پھیلاؤ ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا' حتیٰ کہ پانی ہی پانی رہ جائے۔ پھر انہوں نے رسے کو زمین پر ڈال دیا اور ایک سرے سے پکڑ کر اسے ہلانے لگے اور وہ فرش پر اٹھ اٹھ کر دوڑنے لگا۔ "یہ دیکھو یہ لہریں ہیں۔ رسہ حرکت کر رہا ہے پر چل نہیں رہا۔ لہروں کی طرح یہ حرکت آنکھ کا فریب ہے۔ سمندر میں پانی نہیں چلتا' چلتا دکھائی دیتا ہے۔ بس غور سے دیکھو۔ اب جو آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں تو کالا نمکین سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے جس میں میری ناؤ

KitaabPoint.blogspot.com

ڈول رہی ہے اور چچا اسے تکھے رہے ہیں۔ چچا کے منہ سے کف جاری تھا۔ تخیل علم کا واحد علم بردار ہے۔ تخیل علم کا پائے ستون' علم وہ طاقت ہے جو ان دیکھی دکھا سکے۔ ان جانی سمجھا سکے۔ جزیرے کے گرد گھوم کر اسے جزیرہ سمجھنا' اونہوں' یہ تو جاہل بھی کر سکتا ہے۔ عالم کا کام نہیں کہ سمندر دیکھنے کے لیے پشاور سے کراچی بھٹکتا پھرے۔ عالم کا کام ہے کہ سمندر کو گھر بلا لے۔ کمرے میں بند کر دے دوات میں مرکوز کر دے۔ دریا کو کوزے میں بند کر دے۔ ان دیکھے ستاروں کو....!! اس دن سے آج تک میں سمندر سے یوں واقف ہوں جیسے قلاش اپنی جیب سے لیکن پڑھانے میں چچا کا کوئی ثانی بھی ہو۔ ابھی آپ ان سے ملے ار ابھی انہوں نے آپ کو پڑھانا شروع کر دیا اور مزہ یہ ہے کہ آپ کو شک بھی نہ پڑے گا کہ وہ آپ کو پڑھا رہے ہیں۔ بلکہ آپ سمجھیں گے کہ آپ خود انہیں کوئی بات سمجھا رہے ہیں چونکہ وہ آپ سے چھوٹے چھوٹے سوال پوچھیں گے اور آپ کو ان سوالات کی معصومیت پر ہنسی آنے لگے گی۔ پھر یکلخت پردہ سرک جائے گا اور کوئی نہ کوئی نکتہ اپنا راز کھول دے گا اور آپ حیران رہ جائیں گے۔ فطرت آپ کے سامنے برہنہ کھڑی ہوگی پھر آپ کو احساس ہوگا کہ آج تک کس قدر جہالت میں رہے۔

ان جانی باتوں کے متعلق پڑھانا میں نے چچا سے سیکھا ہے۔ لیکن اس عمل میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ چیزوں کو نہ جاننا عائد ہوتا جاتا ہے اور صاحب سامنے ہوتے ہوئے انہیں نہ جاننا دل گردے کا کام ہے۔ اگر اتفاقیہ طور پر یا حادثہ ہو جانے پر آپ انہیں جان لیں تو پھر پڑھانے کی کیا خوبی۔ یہ عالموں کا کام نہیں' مثال کے طور پ ۳ر آ ئین سٹائن کو لیجئے۔ بھرے گھر میں بیٹھ کر خلا کو جان لیا۔ اسے کہتے ہیں عالم' لیکن آپ جانتے ہیں آزادی کے ساتھ پابندیاں بھی ہوتی ہیں۔

مصیبت یہ ہے کہ میرے محکمہ والوں کو شک پڑ چکا ہے کہ میں پڑھاتا ہوں۔ سکول ماسٹری نہیں کرتا۔ اس لئے میری نوکری خطرہ میں ہے۔ مثلاً ''خشک ہوا'' پڑھا رہا ہوں (ایسے موضوع کے متعلق پڑھانے میں میرا جی لگتا ہے چونکہ نہ تو میں نے ہوا کو دیکھا ہے کبھی اور نہ خشکی کو' یعنی سمندر کی طرح یہ بھی اک ان جانا موضوع ہے) تو ہر قابل استاد کی طرح میں جوش میں آ جاتا ہوں۔ خشک ہوا' ہوں' ہوا' ہوا کیا ہے۔ کیا ہے ہوا؟ تم بتاؤ خزانچی' اونہوہ یہ بات نہیں۔ سنو ہوا وہ ہے جو چلے' جو ہر جگہ کو پر کر دے جیسے' جیسے بیوی۔ کیا سمجھے؟ ہیں؟ کچھ پروا نہیں ہم سمجھائیں گے' سنو خاموش' سنا تم نے یعنی پاکستانی بیوی وہ ہے جو گھر کی ہر خالی جگہ پر کرنے میں لگی رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر خالی جگہ پر کوئی نہ کوئی چیز رکھنے میں لگی رہتی ہے۔ خالی جگہ کیا ہے' ہوں؟ خالی جگہ....... بلینک صفحے جو امتحان میں پر کئے جاتے ہیں۔ ہر مستند لفظ کے ساتھ کیا آتی ہے۔ شاباش سوچو' ہاں' آن ایٹ' یعنی پریپوزیشن' تو بلینک وہ ہے جو پریپوزیشن سے پر کیا جائے جس طرح شرفا کے ساتھ بیوی ٹانکی ہوئی ہوتی ہے۔ مثلاً تم' تم ابھی بلینک ہو تمہارے ساتھ پریپوزیشن

KitaabPoint.blogspot.com

نہیں یعنی بیوی نہیں۔ لیکن جلد ہی تم پر کر دیئے جاؤ گے۔ یعنی بیاہ ہو جائے گا۔ شاباش ٹھیک۔ بیاہ وہ جب باجہ بجتا ہے۔ گھوڑے پر سواری ہوتی ہے۔ بہت اچھے بہت اچھے اچھا تو تم سب سمجھ گئے کہ ہوا خالی جگہ پر کرتی ہے۔ لیکن ہم تمہیں ایک راز بتاتے ہیں سمجھے۔ یعنی ہوا میں بھی خالی جگہ ہوتی ہے جس میں وہ پانی بھر لیتی ہے جیسے سقہ مشک میں تو خشک ہوا وہ نہیں جس میں پانی موجود نہیں بلکہ جو چاہے پانی سے بھری ہوئی ہو مگر پانی چھینکے نہیں یعنی بارش نہ کرے ...... ٹھیک ہے۔ بہت اچھے۔ یعنی سرمایہ دار کی طرح۔ سرمایہ دار کیا ہوتا ہے۔ خوب خوب' ہاں جس کا بڑا پیٹ ہو یعنی توند' شاباش' تو سرمایہ دار کو سرمایہ دار کہنا چاہیے؟ ہر گز نہیں۔ بھک منگا چونکہ وہ سرمایہ اکٹھا کرتا ہے بانٹتا نہیں شاباش خشک ہوا کی طرح۔

افسروں کو شبہ ہو جاتا ہے کہ میں سکول ماسٹری کرنے کی جگہ پڑھا رہا ہوں اور وہ بیدا تھا دبے پاؤں آتے ہیں تا کہ مکمل ثبوت مل جانے پر میرا کیس سرکاری طور پر چلا سکیں۔

لیکن میں بھی پرانا سکول ماسٹر ہوں پڑھاتے ہوئے اصولاً ایک آنکھ کمرے میں اور دوسری باہر رکھتا ہوں اور انہیں آتا دیکھ کر معاً پڑھانا چھوڑ کر سکول ماسٹری شروع کر دیتا ہوں۔ ہاں تو بچو خشک ہوا وہ ہوتی ہے جس میں پانی کی بوند تک نہ ہو۔ قلاش کی جیب کی طرح ٹھیک ہے شاباش۔

اگر مقدس کتابوں کو مقدس ہونے کے علاوہ سچا بھی مان لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پڑھانا اس صاحب عقل نے ایجاد کیا جس کے علم اور عبادت پر خود اللہ میاں ناز کرتے تھے۔ یعنی ابلیس' ابلیس کا سب سے پہلا شاگرد عورت تھی۔ جس نے اس سے سبق پڑھا اور پھر آدم کے سامنے جا دہرایا۔ اگرچہ اللہ میاں نے انہیں موردِ سزا قرار دیا۔ لیکن قرائن سے ظاہر ہے کہ وہ پڑھانے کی تاثیر کے قائل ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے اس تبرک عمل کو اپنا لیا اور پیغمبروں کے ذریعے بنی نوع انسان کو اپنی عظمت کا سبق پڑھانے لگے۔ اس زمانے میں بھی ہر کس و ناکس کا فرض تھا کہ چاہے پڑھے یا نہ پڑھے لیکن سچے دل سے ایمان ضرور لے آئے۔ (آجکل بھی کلاس روم میں سکول ماسٹر اس امر کا مطالبہ کرتا ہے چونکہ اللہ میاں کی تقلید سے بہتر طریقہ کار کیا ہو سکتا ہے؟) اس کے بعد پادری' مولوی' پنڈت نے پیغمبروں کی نقل اتارنا شروع کر دی۔ پھر مولویوں نے اس شغل الدنی قرار دیا گیا۔ پھر بڑے بڑے استادوں نے اسے چھپا چھپا کر رکھنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ علم دولت سمجھا جانے لگا اور پڑھانا سب سے افضل حکمت عملی۔ اسی وجہ سے عالموں کو حکیم کہنے کا رواج پیدا ہوا۔ غرضکہ پڑھانا ایک راز بن گیا اور علم خزانہ' یعنی عالم اور حکیم سرمایہ دار سمجھے جانے لگے اصول کی بات ہے کہ سرمایہ داروں کے خلاف جلسے ہوتے ہیں۔ انجمنیں قائم ہوتی ہیں اور لوگ نعرے لگاتے ہیں تو صاحب لوگوں نے مل کر فیصلہ

KitaabPoint.blogspot.com

کیا اور وہ سب پڑھنے سے منکر ہو گئے تا کہ علماء پر واضح ہو جائے کہ پڑھانے کی توقیر اسی بات پر قائم ہے کہ پڑھنے والے ہوں اور وہ پڑھنا چاہیں۔

جب سرکار عالیہ نے دیکھا کہ حالات بگڑ رہے ہیں تو حسب معمول اس نے سمجھ لیا کہ حکمت علمی سے کام لینا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فیصلہ ہو گیا کہ صرف وہی پڑھا سکتے ہیں جو لبھانے کی طاقت رکھتے ہوں تا کہ پبلک "اوپینین OPINION" نہ بگڑے یعنی پڑھنے کے دوران میں دلچسپی کا احساس اس قدر غالب رہے کہ پڑھنے والے کو شبہ نہ ہو کہ اسے پڑھایا جا رہا ہے۔ اس کے بعد پڑھانا' ریڈیو' سینما' عورت اور اخبار کے ذمے ہو گیا اور سکولوں میں چن چن کر ایسے ماسٹر تعینات کیے گئے جنہیں لبھانے سے دور کا تعلق تک نہ تھا اور ان پر واضح کر دیا گیا کہ ان کا کام سکول ماسٹری کرنا ہے پڑھانا نہیں۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ پڑھانا نہ شروع کر دیں یونیورسٹیاں کھولی گئیں تا کہ پڑتال کرتی رہیں کہ کوئی سکول ماسٹر پڑھاتا تو نہیں رہا۔

نہ جانے وہ کون ان پڑھا تھا جس نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ میں پڑھانے کو پڑھنے پر ترجیح کیوں دیتا ہوں۔ کسی بچے کے برتاؤ کا مطالعہ کر کے دیکھ لیجئے وہ آپ کو نہ جانے کیا دکھائے گا۔ یہ دیکھو' دیکھا کیا ہے یہ؟ ہوں' یہ بندوق ہے۔ بندوق اور بندوق وہ ہوتی ہے جو آپ ہی ٹھس کر کے چل پڑے۔ جب کوئی کوا منڈیر پر بیٹھا ہو تو ویسے نہیں' بس اسے یوں دبا دیا یوں۔ ٹھا "دیکھا؟" آپ حیران رہ جائیں گے۔ اب اگر آپ اپنی عزت بچانے کے لیے اس حقیقت کے منکر رہیں کہ وہ موقع پر کر آپ کو پڑھا گیا ہے تو آپ کی مرضی۔ بہر حال ظاہر ہے کہ ایک بچہ بھی پڑھانے کو پڑھنے پر ترجیح دیتا ہے اگر آپ گھوریوں کی مدد سے اسے پڑھانے سے باز رکھیں گے تو وہ اپنی بہن کو پڑھائے گا۔ نہیں تو دوست کو سہی۔ دوست نہ ملے تو کھلونے تو ہر سے پاس ہوتے ہیں اور کھلونوں کو پڑھانے میں کئی ایک سہولتیں ہیں۔ ایک تو وہ آپ کی بات بڑے غور سے سنتے ہیں اور دوسرے وہ آپ پر شک کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔

پڑھانے کے عمل میں دو خوبیاں ہیں۔ مثلاً پڑھتے ہوئے پڑھنے والے پر لازم ہوتا ہے کہ وہ سچے دل سے محسوس کرے کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ یعنی وہ جاہل یا بے وقوف ہے۔ اگر یہ احساس عام ہو جائے تو یہ ترقی تہذیب سب فنا ہو جائے اور ہم سب الوؤں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ جائیں۔ اس کے برعکس پڑھانے والے میں دو احساس ضرور ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ ہمہ دان ہے اور دوسرا یہ کہ پڑھنے والا جاہل مطلق ہے۔ ہمہ دانی کے احساس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ پڑھانے والے کی بلندیوں سے پڑھنے والے پر جھکتے ہیں۔ جیسے کوئی سخی بھکاری کا کاسہ بھر رہا ہو یا جیسے کوئی جذبہ ہمدردی سے لبریز ہو کر بھرے ہوئے لوٹے کی

KitaabPoint.blogspot.com

مصداق اوندھا ہو گیا ہوتا کہ پیاسا پی سکے' دوسری خوبی اس بات میں مضمر ہے کہ آپ پڑھنے والے کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف متوجہ ہو۔اویا اسے بلندیوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

دوسروں کو بے وقوف سمجھنے کے ان گنت فوائد ہیں۔ اگر آپ سچے دل سے دنیا والوں کو بے وقوف جان لیں تو معاً تمام جھگڑے' فساد' گلے شکایات صابن کی جھاگ کی طرح اڑ جائیں اور ہر طرف مہاتما بدھ کا نروان چھا جائے۔ چاہے لوگ بڑھ تلے بیٹھے ہوں یا بجلی کے قمقمے غالباً یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔فرض کیجئے آپ مجھے خالص بیوقوف سمجھتے ہیں تو اس صورت میں میری بات پر غصہ محسوس کرنا بے معنی ہو جائے گا۔ بے وقوف کی بات پر غصہ کیساتھ غصہ تو چالاک پر آتا ہے۔غصہ نہ رہا تو گلہ اور شکوہ بے معنی ہو گیا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر آپ مجھے سچے دل سے بے وقوف سمجھ لیں تو آپ کے لیے ناممکن ہو جائے گا کہ مجھے کچھ اور سمجھیں۔یعنی آپ مجھے چالاک' کینہ پرور غبی وغیرہ نہ سمجھ سکیں گے یعنی نہ بداعتمادی رہے گی نہ چڑ اور نہ کینہ پروری۔اس کے علاوہ آپ مجھے گناہ بگار نہ سمجھ سکیں گے نہ کافر نہ بے ایمان جو گناہ ثواب میں تمیز نہیں کر سکتا وہ بھلا گناہ کیسے کرے گا زیادہ سے زیادہ آپ میری حماقتوں پر ہنسیں گے۔ تمسخر ہی سہی یعنی بے وقوف آپ کو ہنسا سکتا ہے' احساس برتری دے سکتا ہے اور بس اور یہ دونوں باتیں نعمتیں ہیں جو بڑی مشکل سے نصیب ہوتی ہیں۔

مجھے گدھے پر رشک آتا ہے اس عقلمند جانور نے اپنی بے وقوفی کا پرچار کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے ہر مشکل کام اور ذمہ داری سے محفوظ کر لیا ہے۔اب وہ بڑی سے بڑی چالاکی کرے تو بھی آپ اسے حماقت پر معمول کر کے ہنس دیں گے اور پیار سے کہیں گے گدھا ہے گدھا۔ چونکہ آپ اسے خالص بے وقوف تسلیم کر چکے ہیں اور حماقت کے سوا اور کسی بات کی توقع نہیں رکھتے اور گھوڑا .... بے وقوف!!! اپنی ذہانت کا ڈھونگ رچا کر ہمیشہ کے لیے غلام بن چکا ہے۔ ہر کام جس میں ذہانت کی ضرورت ہو اس کے ذمے ہو چکا ہے۔ مثلاً بھرے بازاروں میں تانگہ لئے پھرنا۔لڑائیوں میں سواروں اور توپوں کو لے کر آگے بڑھنا۔شادی میں دولہا کو اٹھائے پھرنا۔اس کے برعکس گدھا' زیادہ سے زیادہ مٹی کا بورا اٹھایا اور بس۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے سرکاری کلرکوں نے گدھے کی عقلمندی کو محسوس کیا اور اس زریں اصول سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ بہرحال وہ اس اصول سے زیادہ فائدہ حاصل نہ کر سکے چونکہ بے وقوف یا جاہل دکھائی دینا آسان کام نہیں۔اب اگر وہ خوش خط ہوتے ہوئے بھی خوش نویس نہیں ہوتے یا ٹائپ جانتے ہوئے بھی ٹائپ نہیں جانتے تو صرف اس لئے کہ انہیں خودستائی پسند نہیں۔ اگر آپ سرکاری ملازم ہیں تو ان باتوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔لیکن اگر آپ سرکاری ملازم نہیں تو ضروری

KitaabPoint.blogspot.com

ہے کہ آپ نے پکوڑوں کی دوکان کھول رکھی ہے یا تانگہ چلاتے ہیں۔یعنی کوئی ایساویسا کام کرتے ہیں ان حالات میں آپ کو یہ نکتہ سمجھنے کی نہ تو ضرورت ہے نہ اس کے سمجھنے میں فائدہ ہے۔

کسی کو بے وقوف سمجھنا یا بے وقوف سمجھا جانا بڑی بات ہے۔چونکہ اس کے ہونے سے دنیا کی جملہ برائیاں اور زندگی کی جملہ مشکلات ختم ہو جاتی ہیں۔دنیا کو بے وقوف ہونے کا احساس دیتا ہوں۔اس طرح زندگی کو غصہ' انتقام' لڑائی' کینہ اور فساد سے پاک کرتا ہوں کیونکہ میں استاد ہوں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

کہی ان کہی

سنا ہے کسی زمانے میں لوگ اس لئے باتیں کرتے تھے کہ اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر سکیں اور شاید اسی لئے وہ کم گو ہوتے تھے۔ ان دنوں جذبات کو قابو میں رکھنا مستحسن سمجھا جاتا تھا اور خیال کیا جاتا تھا اور خیال کی وقعت موقع محل پر مبنی ہوتی تھی۔ اس لئے اس زمانے میں خاموشی عقل کی دلیل تھی۔ بہر حال وہ سننے والے لوگ تھے اس کے برعکس آج کل ہم اپنی اپنی کہنے کے مشتاق ہیں۔

تہذیب حاضر کا تقاضہ ہے کہ کھانے کی میز پر ہوٹلوں میں دفتر یا ریل گاڑی میں ریستورانوں میں کہیں کوئی آشامل جائے ہر شریف آدمی پر لازم آتا ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی بات چھیڑ دے۔ خاموشی جہالت سمجھی جاتی ہے اور ہر کس و ناکس کا فرض اولین ہے کہ وہ مہذب نظر آئے لیکن کسی دو اصحاب کی باتیں سنیئے۔ آپ محسوس کریں گے کہ وہ لمبی چوڑی اور ہلکی پھلکی ہونے کے باوجود کچھ بھی اظہر نہیں کرتیں اور بسا اوقات ''مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا'' کا واضح اظہار ہوتی ہیں۔ سڑک پر بازار میں کئی ایک ایسے جوڑے آپ کو نظر آئیں گے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہوا ہے۔ ہونٹوں پر کوفت زدہ نمائشی مسکراہٹ ہے۔ پاؤں میں اضطراب کہ کب جاں چھٹے اور کام پر جائیں اور منہ پر ملائم سا۔ ''اچھا جی تو آج کل کیا شغل ہے؟'' ایک کو یہ فکر وامنگیر ہے کہ دوسرا اسے بد اخلاق نہ سمجھے دوسرے کو یہ خیال ہے کہ اسے بد مذاق نہ سمجھا جائے دونوں اس ملاقات سے اکتائے ہوئے ہیں لیکن جدا ہونے سے ہچکچاتے ہیں۔ بار بار ہاتھ ملائے جاتے ہیں اور پھر پکڑ لئے جاتے ہیں اس کے برعکس ان لوگوں کو دیکھیے جنہیں بیک ورڈ کہا جاتا ہے۔ ملے مغل گیر ہوئے اور پھر پاس ہی کسی بند دکان' پل یا دہلیز پر اطمینان سے جا بیٹھے۔ ایک بولا'' سائیں حال ڈے'' (مزاج کیسے ہیں) آپ بصد شوق کام پر چلے جائیں اور اسے اطمینان سے سرانجام دیں کیونکہ جب آپ واپس آئیں گے تو وہ اصحاب جوں کے توں بیٹھے باتیں کر رہے ہوں گے۔

کلبوں میں' ہوٹلوں میں ریل میں اور کھانے کی میز پر گفتگو کرنے کے شوقین ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ہم میں کہتے سبھی ہیں لیکن سنتا کوئی نہیں اور سنے بھی تو صرف اس لئے کہ کب وہ ختم کرے اور میں شروع کروں یعنی ہم سب گفتگو کے ذریعے اپنے آپ کو پیش کرنے کے عادی ہیں۔ دور حاضر میں ''ہونا'' نہیں بلکہ اپنے آپ کو پیش کرنا زندگی کی دلیل ہے۔

ویسے تو اپنے آپ کو پیش کرنا انسان کی پرانی عادت ہے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو پیش کرتا آیا ہے کبھی افعال کے ذریعے پیش کرنے

KitaabPoint.blogspot.com

کے عادی ہیں۔

پیش کرنے کی دو صورتیں ممکن ہیں ایک تو اپنے آپ کو ایسے ظاہر کرنا جیسے کہ درحقیقت ہم نہیں اور دوسری اپنے آپ کو ایسے ظاہر نہ کرنا جیسے کہ ہم ہیں۔یعنی پہلا انداز تو نمائشی یا اعتباری ہوا اور دوسرا پردہ پوش۔ایک انداز سے تو ہم لوگوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ ''دیکھا کیا خوب آدمی ہوں میں'' اور دوسرے سے ''اونہوں'' میں ایسا شخص نہیں ہوں۔ پہلا انداز زیادہ زیادہ تر اس زمانے میں برتا جاتا ہے۔جب شخصیت کی چمک دلچسپی اور رنگینی قابل قدر سمجھی جائے اور دوسرا جب رسمی اخلاق کا دور دورہ ہو۔اگرچہ ہر زمانے میں پیش کرنے کے یہ دونوں پہلو کام میں لائے جاتے ہیں مگر فوقیت اسی پہلو کا حاصل ہوتی ہے۔ جسے بہتر مانا جائے آج کل جبکہ ترقی پسندی کا دور دورہ ہے اور رسمی اخلاق کی دھوم نہیں۔اپنی شخصیت کو دلچسپ اور رنگین ظاہر کرنا ازبس ضروری سمجھا جاتا ہے۔اس لئے آج کل پیش کرنے کا پہلا پہلو فیشن ہے۔

ہاں تو اپنے آپ کو پیش کرنے کے کئی ایک دلچسپ پہلو ایجاد ہی نہیں کرنے پڑتے بلکہ کئی ایک بھدے اور بدنما پہلوؤں کو چھپانا بھی پڑتا ہے۔جس طرح جمالیات کے علاوہ عورت کو گھونگٹ کی ضرورت ہوتی ہے جس کی مدد سے چہرے کا ایسا ویسا حصہ چھپایا جا سکے۔بلکہ یوں کہئے کہ جملہ جمالیات غازہ' پاؤڈر زیبائشی چیزیں اس لئے ہیں کہ وہ بدنمائی کو چھپانے میں مدد دیتی ہیں۔یعنی نمائش پردہ پوشی کی ضرورت کے احساس کا اظہار ہے۔پاؤڈر اور غازہ کالی عورتوں نے ایجاد کیا تھا۔چنانچہ انہیں اس کی ضرورت تھی پھر جب گوریوں نے دیکھا کہ کالیاں ان کی ہمسری کا دعویٰ کر رہی ہیں تو وہ بھی ملنے لگیں۔حتیٰ کہ آج دونوں میں تمیز مشکل ہو چکی ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ ہماری شخصیت کا ہر پہلو چاہے ہم اسے قابل اظہار سمجھیں یا نہ سمجھیں اپنا اظہار چاہتا ہے۔اگر ہم اسے دبائے رکھیں اور ظاہر ہونے نہ دیں تو وہ آنکھ بچا کر کسی نہ کسی روپ میں ظاہر ہو جائے گی یعنی ہر بات جو زبانی ہو یا گونگی کچھ کہنے کے علاوہ کچھ چھپا رہی ہوتی ہے یعنی ہر بات کی اوٹ میں ایک ان کہی ہوتی ہے۔

کوئی سے دو مہذب اصحاب کی باتیں سنیئے۔آپ محسوس کریں گے کہ ان کی باتیں کچھ بھی نہیں کہہ رہیں یعنی ان کی باتوں سے آپ ان کی حقیقی شخصیت کے متعلق اندازہ نہیں لگا سکیں گے شاید آپ بھی اس وقت محسوس کریں گویا ہندوستانی چائے کا اشتہار پڑھ رہے ہیں جو گرمیوں میں نہایت ٹھنڈک پہنچاتی ہے یا آپ محسوس کریں گے کہ وہ اصحاب صرف اس لئے بولتے جا رہے ہیں کہ نہ بولنا بے مہری' یا نااہلیت سمجھا جائے گا اور اپنی شخصیت کے متعلق ایسا ڈیبے زار کرنے والا اشتہار دینا انہیں گوارا نہیں۔

ابھی تک ہم میں اس قدر کمال پیدا نہیں ہو سکا کہ نت نئی سے نئی نمائشی بات پیدا کر سکیں۔عام طور پر ہر فرد نے اپنے متعلق کئی ایک

KitaabPoint.blogspot.com

دلچسپ اور چست فقرے ایجاد کر رکھے ہیں جنہیں موقعہ ومحل پر چلا دیا جاتا ہے۔ ہمارے نمائشی اظہار کا ذخیرہ اس شیشے کی الماری کی طرح محدود ہوتا ہے جس میں ہر بڑی دکان کے سامنے خوبصورت اور دلکش چیزیں چنی ہوتی ہیں تا کہ راہ چلتوں کی نظر چڑھ کر انہیں خرید پر مائل کر سکیں۔

گھر میں میاں بیوی اپنی اپنی نمائشی باتیں اتنی بار ایک دوسرے کے سامنے دوہرا چکے ہوتے ہیں کہ انہیں از سر نو دہرانا دلچسپی کی بجائے بےزاری پیدا کرتا ہے۔ یہ پرانے ریکارڈوں کا ڈبہ بند پڑا رہتا ہے۔ البتہ عروسی کے زمانے میں بعد خاموشی کا ڈر انہیں اس بات پر مائل کرتا ہے کہ وہ پڑوسی یا برادری والوں کی بات چھیڑ لیں اور لوگوں کی عیب جوئی میں وقت کاٹیں جنہیں دوسروں پر نکتہ چینی میں دلچسپی پیدا ہو جائے ان کی گھریلو زندگی اطمینان سے کٹ جاتی ہے لیکن جو اس مفید اور دلچسپ عادت کو نہیں اپنا سکتے انہیں خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ بسا اوقات میاں بیوی کو پنی اپنی ان کہی چھپانے کا فکر دامن گیر ہوتا ہے اس لئے وہ خاموشی سے ڈرتے ہیں کہ مبادا وہ بات منہ پر آ جائے اس لئے حمید لبا اور محمود کی ماں کا قصہ جاری رکھنا لازم ہو جاتا ہے۔ جیسے ہم گھر یک بے بکار چیزیں اس لئے سنبھال کر نہیں رکھتے کہ ان کی کوئی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس ڈر کے مارے رکھتے ہیں کہ پھینک دینے کی صورت میں انہیں کوئی اور اٹھا کر لے جائے۔ مغربی ممالک میں اگر گھر میں کوئی مہمان آ جائے تو دونوں میاں بیوی اپنی اپنی باتوں کے پٹاخے کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بےچارا مہمان سمجھتا ہے کہ اسے محظوظ کیا جا رہا ہے اور اس توجہ پر شکر ادا کرنے کے خیال سے بات بات پر مسکرانا اپنا فرض سمجھتا ہے وہ دونوں سمجھتے ہیں "دیکھا کیسی دلچسپ باتیں ہیں ہماری"

نوجوانوں کو دیکھئے شوخ' چست اور کراری باتیں ڈھونڈنے میں کس سرگرمی سے لگے رہتے ہیں۔ جوان کی شخصیت کی رنگینی پیش کرنے میں کام آئیں شاید اس لئے آ کروائیلڈ' شا اور نیٹشے جیسے شوخ اور بھڑکیلے ادیب اور فلسفی اس قدر پسند کئے جاتے ہیں اور ہارڈی جیسے گہرے ادیب صرف درسی کتابوں میں رہتے ہیں

شاید آپ کو کسی ایسے صاحب سے ملنے کا موقع ملا ہو جو مسلسل باتیں کرنے کا عادی ہو اس میں بات سن کر آپ محسوس کرتے ہیں کہ وہ سنائی نہیں جا رہی بلکہ صرف کہی جا رہی ہے۔ کئی لوگ صرف اس لئے اپنی بات کا سلسلہ نہیں ٹوٹنے دیتے کہ مخاطب کو انہیں جھٹلانے کا موقعہ نہ مل جائے۔ یا وہ نکتہ چینی نہ کر دے۔ انہیں یہ موہوم احساس ہوتا ہے کہ ان کی بات بچگی ہے یا مناسب درجہ تک دلچسپ نہیں۔ ایسے بزرگ بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو بڑی شدت سے مصروف ہوتے ہیں کہ ان کی بات سنی جائے اور بات کے دوران میں کوئی رکاوٹ یا حرکت جو مخاطب کی لاپروائی کی دلیل ہو سکے برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسے اصحاب کو

KitaabPoint.blogspot.com

بات بات پر سنا تم نے۔ بھئی سنو بھی نا بے حد دلچسپ بات ہے۔ ذرا غور کرنا ایسے فقرے دہرانے کی عادت ہوتی ہے۔ شاید دل میں شبہ ہوتا ہے کہ ان کی باتوں کو وہ اہمیت حاصل نہیں رہی اور لوگ انہیں وہ وقعت نہیں دے رہے۔ اکثر بات ختم کرتے ہی اس شدت سے کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں کہ آپ بوکھلا جاتے ہیں اور ہنسی میں ان کا ساتھ دینے کی بجائے تعجب سے ان کی طرف دیکھتے ہیں اور وہ از سر نو ایک شدید ترکھی سے اپنے آپ کو دعوت انبساط دیتے ہیں کئی ایک ایسے بھی ہیں جنہیں ایسے خفیہ شعبوں میں کام کرنا پڑتا ہے کہ ہر سے دل کی بات کہہ دینے کا ڈر رہتا ہے۔ اس لئے وہ ادھر ادھر کی باتوں کا سلسلہ باندھ رکھتے ہیں کہ نہ فرصت ملے اور نہ دل کی بات سے گدگدی محسوس ہو۔ دل کی پریشانی تو انسان کو یہاں تک مضطرب کر سکتی ہے کہ کئی ایک تنہائی میں اکیلے بیٹھے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ کسی ایسے شخص کو پاخانے میں بیٹھے ہوئے سنیکس مزے سے باتیں کرتے ہیں۔ مجھے ایک ایسے صاحب کے پڑوسی ہونے کا موقع ملا۔ میرے کمرے اور ان کے پاخانے میں صرف ایک دیوار حائل تھی۔ روز ادھر سے آوازیں آیا کرتیں لیکن مزے کی بات تھی کہ سننے میں یہ معلوم ہوتا گویا ایک مرد اور ایک عورت بحث کر رہے ہیں میں سمجھا شاید کسی سے آشنائی ہے جو دیوار پھاند کر آجاتی ہے اور بے چارے وہاں بیٹھ کر دو گھڑی کے لئے دل بہلا لیتے ہیں لیکن تعجب کی بات تھی کہ ان کی باتیں پیار محبت کی بجائے جھگڑے سے بھری ہوتیں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ میاں کو اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت تھی۔ اور بات کرتے ہوئے وہ ڈرامائی اصولوں کا خیال رکھتے اور بیوی کی بات کو عورت کی آواز و انداز میں ادا کرنے کی مہارت حاصل کر چکے تھے۔

کسی بڈھے پنشنر کے پاس بیٹھ جائیں ادھر آپ اسے ملے اور ادھر اس نے کوئی آپ بیتی چھیڑی۔ گویا وہ اتنا عرصہ آپ ہی کے انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب آپ ملیں گے اور وہ آپ کی ضیافت طبع کے لئے وہ بات سنائیں۔ اگر آپ مجھ جیسی طبیعت کے مالک ہیں تو چپ چاپ بیٹھے سنتے رہیں گے میرا مطلب ہے آپ کا انداز ایسا ہوگا جیسے آپ بے حد شوق سے سن رہے ہیں لیکن اگر آپ میں جرائت ہے تو آپ معاً بول اٹھیں گے۔ ''حضرت یہ بات تو آپ نے مجھے پہلے بھی سنائی تھی۔'' لیکن آپ کی یہ بے معنی بات انہیں خاموش نہ کر سکے گی۔ اچھا تو وہ کنور اودھے سنگھ کے شکار کی بات تو نہیں سنی تم نے وہ تو حد ہو گئی ہے۔ حد ہے۔ بحد دلچسپ بات ہے کھی ہاں تو اور وہ بات شروع کر دیں گے۔

یا اگر غلطی سے آپ انہیں بات سنانے کی بھول کر بیٹھیں ہمیں گھوڑے پر سوار ہو گیا'' تو وہ معاً آپ سے کہیں گے۔ ''گھوڑے'' ہاں گھوڑے کی بھی سن لیجئے۔ مہاراج کا اردلی اور میں کھڑے تھے۔ ذرا قطع کلام معاف۔ مہاراج کی آمد کا انتظار تھا۔

KitaabPoint.blogspot.com

اول تو ان کی بات سے بات نکلے گی۔ حتیٰ کہ آپ کو جان چھڑانا مشکل ہو جائے گی' لیکن بلفرض محال وہ گھوڑے کی بات پر ہی اکتفا کریں او آپ کو اگلا فقرہ سنانے کی مہلت مل جائے۔ ہمارے پاس صرف دو بندوقیں تھیں۔ تو وہ بالکل بول اٹھیں گے۔ آپ کی بات کاٹ رہا ہوں لیکن بندوق جن کے بارے میں مہاراج کا اس وقت نہ جانے آپ کیا محسوس کریں لیکن مجھ سا دب جانے والا انسان تو یہ جان جاتا ہے اور تسلیم کر لیتا ہے کہ میں بات نہیں سن رہا بلکہ ان کے سلسلہ خیال کو" پرامٹ" کر رہا ہوں۔ ایک صاحب اپنی آپ بیتیاں سنانے کے شوقین تھے مگر ان کا انداز خوب تھا۔ دوسرے کی بات یوں کاٹتے کہ اسے اپنیات کٹنے کا احساس تک نہ ہوتا۔ ''آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں' بجا ہے۔ گھوڑے پر سوار ہونا بھی ایک مصیبت ہے'' معلوم ہوتا ہے آپ کو شکار پر جانے کا خوب تجربہ ہے لیکن کنور صاحب تھے' ان خوش کن فقروں کو سن کر جب تک آپ خوشی سے پھولنے اور سمانے میں لگے رہتے۔ ان کی بات ختم ہو جاتی اور آپ کی بات ضمنی طور پر تصدیق ہو جاتی۔ چاہے آپ چوتھائی بات ہی سنا سکتے لیکن ایک اطمینان سے گھر جاتے چونکہ پوری مگر روکھی بات سے چوتھائی مصدقہ روغنی بات بہتر ہے۔

پاکستان کی نوجوان لڑکیوں میں نمائشی باتیں اس قدر مروج نہیں جس قدر نمائشی حرکات۔ وہ مغربی خاتون کی طرح بظاہر بے تعلق باتوں سے اپنی شخصیت کی رنگینی کا اظہار نہیں کر سکتیں۔ اگر کوشش بھی کریں تو نمائش عریاں ہو جاتی ہے۔ اول تو عام طور پر ان کا غیر مردوں سے ملنا جلنا ممنوع نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس رسمی خلیج کی وجہ سے جو دونوں کے درمیان حائل رہتی ہے نمائشی حرکات کو نمائشی باتوں پر فوقیت حاصل ہے۔ چونکہ حرکات کی اپیل دور تک چلتی ہے۔ شاید رسمی اخلاق اور شرمیلے پن کی وجہ سے ہندوستانی لڑکی کی اپیل ایک بے نیازی سے پیدا کی جاتی ہے۔ اگرچہ اسے واضح کرنے کے لئے کبھی کبھار انکھیوں سے دیکھنا ضرور ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں گفتگو کی اپیل ممکن نہیں چہ جائیکہ گفتگو میں مغربی خاتون کی سی ہمدردی اور احساس کی چاشنی پیدا کی جائے۔

عام طور پر ہندوستانی عورتوں کی گفتگو کا دائرہ ابھی ہم جنسوں تک ہی محدود ہے۔ غنفوان شباب کا ''ہم جنسی دور'' گزارنے کے بعد انہیں خواہش نہیں ہوتی کہ وہ ہم جنسوں کے لئے باعث کشش و جاذبیت ہوں۔ اس کے برعکس وہ ہم جنسوں سے احساس برتری اخذ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور اپنی برتری کے علاوہ دوسروں پر نکتہ چینی میں وقت کاٹتی ہیں۔

بوڑھی عورتوں میں یہ خواہش اور بھی نمایاں ہوتی ہے چونکہ وہ جوانی گزار چکی ہوتی ہیں۔ اور شاید انہیں دل میں احساس ہوتا ہے کہ عورت جوانی کا نام ہے۔ اسی لئے وہ ''آج تھو کھٹے'' کی مصداق عورت کی عظمت کا دارومدار ایسی بات پر قائم کرنا چاہتی ہیں جس کے مطابق جوانی اور حسن عید سمجھے جائیں غالباً اسی لئے بڑھاپے میں وہ رسمی اخلاق اور نیکی کی قائل ہو جاتی ہیں اور ان کی گفتگو میں عیب

KitaabPoint.blogspot.com

جوئی کا پہلو غالب رہتا ہے۔

ہر شخص صبح آنکھ کھلتے ہی اپنے ذاتی لگ لگاؤ کا چشمہ پہن لیتا ہے اور معاً اس کی انفرادی شخصیت قائم ہو جاتی ہے۔ اس چشمہ میں ہم نے ایک دراز اور ایک محدب شیشہ لگا رکھے ہیں جس پر چیز کو ہم نہ دیکھنا چاہیں یا کاٹ دینا چاہیں اسے دراز میں سے دیکھتے ہیں اور جسے کبڑا یا بڑا دیکھنے کی خواہش ہو اسے موٹے یا پتلے حصے سے دیکھتے ہیں یہی لگ لگاؤ آنکھ سے دل میں جا چھلکتے ہیں اور پھر ابھر کر زبان پر آ جاتے ہیں۔ تو ہر بات جو کہی جاتی ہے مذکور کے بارے میں اس قدر اظہار نہیں کرتی جس قدر متکلم کی ان کہی کے متعلق۔

اور دل پر اثر پیدا کرنے کے علاوہ اپنی بات سے اپنے آپ پر بھی اثر پیدا کیا جاتا ہے۔ بچے ڈر کے مارے اندھیرے میں اپنے آپ سے باتیں کیا کرتے ہیں تا کہ اپنی آواز سن کر حوصلہ پیدا ہو۔ بالغ لوگوں کے اپنے منہ سے نکلی ہوئی باتیں بذات خود ان پر اثر ڈالتی ہیں اور عام طور پر افراد کے دل میں اپنے متعلق حسن رنگین پیدا کرنے میں بے حد مفید ثابت ہوتی ہیں اگر آپ بار بار کہیں جی میں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی پرواہ نہیں کرتا تو آپ میں عارضی طور پر اس قدر بے نیازی پیدا ہو جائے گی اور چھوٹی چھوٹی باتوں کی پروا کرنا آپ کے شایان شان نہ رہے گا۔

بزرگ زمانہ حال کا احساس نہیں رکھتے مستقبل تو انہیں موت دکھائی دیتا ہے اس لئے وہ ماضی کو از سر نو بار بار جیتے ہیں ماضی کے واقعات سنانے سے صرف یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس بہانے وہ پھر اسے بتائیں۔ ابتدا میں تو انہیں مخاطب کی ضرورت پڑتی ہے لیکن جب قصہ گرم ہو جائے تو وہ اس واقعہ کی یاد میں کھو جاتے ہیں اور پھر مخاطب کی حیثیت صرف اس قدر رہ جاتی ہے جیسے آنکھوں والے کے ہاتھ میں چھڑی۔

کسی رازدان سے بات کرتے ہوئے بھی ہمارا انداز ایسا ہی ہوتا ہے گویا جنگل میں بیٹھے کسی درخت سے کچھ کہہ رہے ہوں۔ نہ جانے پھر ہمیں یہ گلہ کیوں ہوتا ہے کہ کوئی راز دان نہیں ملتا۔ رازدان سے ہمارا صرف ایک مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ ہمارا راز افشا نہ کر دے۔ ہم اپنا راز کسی سے کہہ دینے کے لیے بے قرار ہوتے ہیں۔ اگر انسان مریں بت کی طرح راز کے تحفظ کی اہلیت ہو تو رازدان کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ کسی بات کو سنی ہوئی سمجھ کر رد کر دینا قطعی جائز نہیں۔ چونکہ بات تو دہرانے سے نکھرتی ہے اور بار بار سننے سے اس میں جان پڑ جاتی ہے۔

حتیٰ کہ سننے والا اسے چلتے پھرتے محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔ ادھر کہنے والا اس میں نت نئے رنگ بھر دیتا ہے۔

میرا اپنا تجربہ ہے کہ معمولی سے واقعہ پر مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اگر اس میں فلاں بات بڑھ جاتی ہے یا اس کا انجام یوں ہوتا تو

KitaabPoint.blogspot.com

کس قدر دلچسپ ہوتا۔ اس کے بعد جب بھی مجھے وہ واقعہ سنانا پڑے تو وہ خیالی نکتہ یا انجام بڑھا دیتا ہوں۔ اس طرح کئی ایک باتیں میں اتنی بار دہرا چکا ہوں کہ تمیز نہیں رہی کہ فلاں بات میں کس قدر حقیقت ہے اور وہ کونسے نکات ہیں جو میں نے تخیل کے زور سے پیدا کئے تھے۔ بات پیدا کرنے سے خدانخواستہ میرا مطلب دروغ گوئی نہیں ہوتا بلکہ لوگوں کو محفوظ کرنا اور آپ جانتے ہوں گے کہ لوگوں کو محفوظ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں میں اس بات کا موقعہ دوں کہ وہ میری حماقتوں پر ہنسیں ورنہ اگر انہیں اپنی عقل یا رنگینیٔ طبع کا قائل کرنے کی کوشش کی جائے تو غالباً وہ چڑ جائیں گے اور اگر انہیں اپنی عقل یا رنگینیٔ طبع کا قائل کرنے کی کوشش کی جائے تو غالباً وہ چڑ جائیں گے اور آپ کو یا مجھے باتونی سمجھیں گے اور کہیں گے بہت بنتا ہے شریف آدمیوں کا دستور ہے کہ ہر بھڑکیلی اور شوخ بات جو انہیں سوجھے کسی غائب سے منسوب کر دیتے ہیں اور ہر حماقت بھری بات کو اپنے لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کو یہ سوچنے یا کہنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ ''سالا بنتا ہے۔''

خدا بچائے کبھی آپ حفیظ کی باتوں میں نہ جا پھنسیں بیٹھنے کی دعوت دینا تو کیا وہ تو آپ کے کھڑے ہونے پر بھی اعتراض کرے گا۔ کہے گا۔ صاحب یہاں کھڑے نہ ہوں آپ۔ اس بے چاری کو ہفتہ بھر میں صرف ایک اتوار کا دن ملتا ہے مجھے وہ دیکھنے کے لئے دیکھ لینے دیجئے بے چاری کو۔ راستہ تو نہ روکیئے اور معاً آپ اس کی بات کے جال میں پھنس جائیں گے حتیٰ کہ آپ کو اس قدر مہلت نہ ملے گی کہ اسے بدتہذیب یا گنوار سمجھیں کہ آپ کو بیٹھنے کی بھی دعوت نہیں دی۔ یہ ظاہر کرکے کہ آپ کا وجود یا آپ کی موجودگی اس کے لئے باعث مسرت ہونا تو کیا عین لگاوٹ ہے وہ آپ کو یقین دلائے گا کہ اسے ذرہ بھر آپ سے بات کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ہر مہذب شخص ایسی صورت میں چلے جانا مناسب نہیں سمجھتا تاکہ دوسرے کو احساس نہ ہو کہ اس نے اس کی بات کا برا مانا ہے اس کے بعد چاہے آپ بیٹھ جائیں یا کھڑے رہیں۔ وہ آپ سے اس انداز سے باتیں کرے گا گویا آپ پر احسان کر رہا ہوں۔ اگرچہ آپ سے باتیں کرنا اس کے لئے تضیع اوقات سے کم نہیں اور آپ قطعی بھول جائیں گے کہ اس کی تمام تر باتیں اخلاق سے بے حد دور ہیں اور دروغ گوئیاں ہیں۔ پھر آپ جب گھر واپس جا رہے ہوں گے تو احساس ہوگا کہ اف کس قدر دیر ہو گئی۔ لاحول ولاقوۃ کیا خرافات تھیں اور آپ کا جی چاہے گا کہ چلتی ہوئی موٹر تلے آ جائیں یا کسی راہ چلتی ہوئی مٹیار کا منہ چڑا لیں۔ یا کسی کو بے نطق سنائیں اور اگر گھر میں بیوی ہے تو آپ کبھی بھول کر بھی ٹمپل روڈ کی طرف نہ جائیں گے۔ اس ڈر کے مارے کہ کوئی صاحب مجھے بے وقوف نہ کہہ دے۔ میں نے طنزاً اور تقریباً کہنا شروع کر دیا۔ حد ہو گئی صاحب۔ دیکھئے میری حماقت یا میری بے وقوفی ملاحظہ فرمایئے۔ ایسے فقرے کہنے سے میرا مطلب نہ تھا کہ خدانخواستہ میں اپنے آپ کو بے وقوف سمجھتا تھا۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو آ دھا دھن جاتا دیکھتے ہیں تو

KitaabPoint.blogspot.com

سارا لٹا دیتے ہیں دوسرے کے منہ سے ایک معمولی سا لفظ سننے سے پیشتر اور اسی ڈر سے میں اپنے متعلق ہزاروں خرافات کہہ دینے سے دریغ نہیں کرتا۔ یہ دلچسپ تجربہ بہت کامیاب رہا اور پھر ایک دم مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ مجھ میں حماقت یہاں وہاں دھبوں کی طرح ہوتی ہے پھر معاً میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنے حماقتی دھبوں پر فخر ہے چونکہ وفا' محبت اور میری جملہ خوبیاں حماقتیں نہیں تو کیا ہیں۔ حتیٰ کہ اب میرا ایمان ہے کہ عقلمندی انسان کے لئے قابل شرم وصف ہے۔ شکر ہے اس پاک پروردگار کا کہ میں بے وقوف ہوں۔

گفتگو کرتے ہوئے کئی بار ہمارے منہ سے ایسی بات نکل جاتی ہے جو ہمارے لئے قطعاً نئی ہوتی ہے۔ ہم خود اس انجانے الہام پر حیران رہ جاتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے الہامات گھر بیٹھے خاموشی میں نہیں سوجھتے اس کے علاوہ خاموش خیالات میں وہ اثر نہیں ہوتا جو کہی ہوئی بات میں ہوتا ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ کتنی بار دوران گفتگو آپ بات شروع کر دیتے ہیں لیکن آپ کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ آپ کیا کہنے والے ہیں یا آپ کو کیا کہنا چاہیے۔ شاید اس لئے کہ ان حالات میں خفت کا ڈر ہوتا ہے آپ ان جانے میں ایسی ایسی باتیں پیدا کر دیں گے کہ خود اپنی بات پر حیران رہ جائیں گے۔ حالانکہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ صرف وہی باتیں کی جاتی اور جا سکتی ہیں جو پہلے سے دماغ یا دل میں موجود ہوں۔ یعنی کیفیات ذہنی کے نفسیاتی طریقے کا نام گفتگو ہے۔

کٹے ہوئے نگینے کی طرح ہر شخصیت کے کئی ایک پہلو ہوتے ہیں۔ شاید ایسے لوگ بھی ہوں جو ہر کسی کے روبرو اپنی شخصیت کے تمام تر پہلو ظاہر کر دیتے ہوں۔ عام طور پر تو ہم چاند کی طرح اپنا ایک پہلو ہی ظاہر کرتے ہیں یعنی ہر شخص سے ہمارے تعلقات اور اظہار ایک خاص قسم کا رنگ اور وضع اختیار کر لیتے ہیں اور جوں جوں ہمارے تعلقات اس فرد سے بڑھتے جائیں ہم پر لازم ہوتا جاتا ہے کہ اس کے روبرو اپنے آپ کو اسی مخصوص روپ میں پیش کریں۔ یعنی ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ چند ایک پہلو اس سے چھپائیں۔ تو تعلقات کے ساتھ ساتھ حجاب کا بڑھنا لازم ہوا۔

ظاہر ہے ہر دوستانہ تعلق ہم پر خصوصی پابندیاں پیدا کرتا ہے۔ اس صورت میں کسی اجنبی کے روبرو وہم مقابلتاً زیادہ آزاد ہوتے ہیں کیونکہ ابھی ہمارے تعلقات اور اظہار نے کوئی خاص رنگ پیدا نہیں کیا ہوتا۔ اجنبیوں سے خاموشی یا تو اس ڈر پر مبنی ہوتی ہے کہ کہیں وہ ہماری بات اچھالتے نہ پھریں اور یا اس خاموشی کے پردے میں ہم اسے ٹٹول رہے ہوتے ہیں کہ وہ کس رنگ کا آدمی ہے تا کہ اس سے ویسے ہی تعلقات پیدا کئے جائیں۔

بات چیت کرنے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ وہ لفظوں کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتی اور الفاظ کی عادت ہے کہ اظہار خیال میں مدد دینے کے علاوہ مشکلات اور غلط فہمی پیدا کریں چونکہ احساسات و خیالات اور الفاظ میں جو تعلق ہے وہ محض خود ساختہ اور اعتباری

KitaabPoint.blogspot.com

ہے۔

نہ جانے ہماری زبان کو کیا ہے۔ ادھر دل نے دھڑکنا شروع کیا اور ادھر زبان گنگ ہوتی ہے جذباتی ہیجان ہماری قوت تکلم اور بیان کا دشمن ہے زبان کی اس خامی پر شاعر ہمیشہ مرثیہ خواں رہے۔ کوئی دیوان اٹھا لیجئے۔ کہیں نہ کہیں اس بات کا رونا ضرور رویا گیا ہو گا۔

بناوٹی اور نمائشی بات کرو تو زبان کی چاشنی اور لوچ سننے کے قابل ہو جاتی ہے۔ لیکن حقیقت کو بیان کرنے لگو تو بے چاری زبان منہ کے لامتناہی خلا میں معلق ہو کر رہ جاتی ہے۔ الفاظ نہیں ملتے دنیا بھر کی رنگین اور بلند شخصیتوں کو شکایت ہے کہ وہ اپنے آپ کو پورے طور پر ظاہر نہ کر سکیں اور جو ظاہر کیا محض ایک دھندلا خاکہ تھا۔

الفاظ ہماری بات اور ہمارے متعلق صرف لوگوں کے دل میں ہی غلط فہمیاں پیدا نہیں کرتے بلکہ اپنے احساسات کے متعلق ہمارے اپنے دل میں بھی غلط فہمیاں قائم کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ ہم خود اپنی باتیں انہی رواجی لفظوں میں سنتے ہیں حتیٰ کہ الفاظ کا یہ خودساختہ بھنور ہمیں اس طرح پھانس لیتا ہے کہ دامن حقیقت ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ وہ مانوس الفاظ یا ان کہی ہمیں بہلا پھسلا لیتے ہیں۔ اور ان کی تہ میں جھانک کر انہیں سمجھنے کا خیال نہیں آتا ہم یہ قطعی بھول جاتے ہیں کہ چراغ کی طرح ہر لفظ اپنی اوٹ میں اندھیرا لئے بیٹھا ہے۔ غالباً ہماری موجودہ جہالت کی یہی وجہ ہے اور ہم مانوس چیزوں اور کیفیات سے واقف نہیں۔

ہر لفظ کی ان کہی ہر شخصیت پر ایک جدا پہلو اجاگر کرتی ہے اور مختلف اوقات اور حالات میں مختلف روپ دھارنے کے باوجود اپنا رنگ قائم رکھتی ہے۔ کبھی تو ہم اسے جان جاتے ہیں لیکن ظاہر کرنا نہیں چاہتے اور کبھی جاننے سے بھی گریز کرتے ہیں۔

اتنی پردہ پوشیوں کے باوجود نہ جانے انسان کے لئے پردہ پوشی کیوں اساس نہیں س۔ ان کہی ہمارے دل میں ایسے بھنور پیدا کرتی ہے جس سے باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے اور ہم عمر بھر اس بھنور میں ڈبکیاں کھاتے رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمیں قطعاً احساس نہیں ہوتا کہ ہم بھنور میں ڈبکیاں کھا رہے ہیں بلکہ سمجھتے ہیں کہ ہم ترقی کر رہے ہیں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

شوق تحقیق

پاکستان کے کسی گاؤں یا قصبے میں چلے جایئے۔ معا لوگوں کا شوق تحقیق آپ پر مرکوز ہو جائے گا۔ گلیوں اور بازاروں میں چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے شرفا حقہ پینا چھوڑ کر آپ کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ چرخہ کاتتی ہوئی عورتیں نظر بھر کر آپ کی طرف دیکھیں گی۔ بچے دہلیز پر کھڑے ہو کر جھانکیں گے۔

"کون ہے؟" "کہاں سے آیا؟" "کیوں آیا؟" "کس خاندان سے ہے؟" "بیوی والا ہے؟" "کیسی ہے وہ" "ایسی ویسی تو نہیں؟" اور اگر آپ کو چند دن کے لئے وہاں قیام کرنا پڑے تو لوگ آپ کے شجرۂ نسب اور گزشتہ زندگی کے علاوہ عادات و اطوار اور چھپے رجحانات سے بھی واقف ہو جائیں گے۔ گردن اٹھا کر چلتا ہے۔ ارے بھئی صرف سفید پوشی ہے اور بس اللہ اللہ خیر سلا پر میں کہوں بنتا ہے۔ خیر ویسے اچھا آدمی ہے۔" "ہاں بھلا چنگا ہے۔"

یہ محسوس کر کے کہ آپ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں کہ واقعی شرف المخلوقات ہیں اور اس لائق ہیں کہ لوگ آپ کو توجہ اور دلچسپی سے دیکھیں اور بازاروں میں چارپائیوں پر بیٹھ کر آپ کی آمد کا انتظار کریں۔ اس کے برعکس کسی مغربی شہر میں جا کر دیکھ لیجئے چاہے آپ سارے کا سارا شہر گھوم پھریں اور لوگوں کی توجہ اپنی طرف راغب کرنے کے لئے سر پر ٹوپی کی جگہ چھاج رکھ لیں اور ٹانگوں پر لہنگے کی جگہ سارنگی کے غلاف چڑھا لیں۔ آپ دیکھیں گے کہ نہ تو کوئی چارپائی پر بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہوگا نہ کوئی عورت آپ کو التفات آمیز نظر سے دیکھے گی بلکہ آپ محسوس کریں گے کہ اپنی راہ چلتے اور اپنی دنیا میں کھوئے ہوئے افراد کے ہجوم کا ایک وسیع ویرانہ پھیلا ہوا ہے اور سڑکوں پر چارپائیوں پر بیٹھے یا دکانوں پر کھڑے ہمدرد محققین کی بجائے موٹریں یوں بھونکتی پھرتی ہیں جیسے رات کو قبرستان میں کتے روتے ہیں۔

کسی محلہ میں رہ کر دیکھ لیجئے۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے واقعہ پر محلہ والے ازراہ ہمدردی تحقیقات شروع کر دیں گے چرچا ہوگا باتیں چلیں گی خیالات کا اظہار ہوگا۔ راہ گیر شوق تحقیق سے بیتاب ہو کر رک جائیں گے اور اپنی رائے سے محلے والوں کو مستفید کئے بغیر آگے نہ جا سکیں گے۔ عورتیں کھڑکیوں میں کھڑی ہو کر ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ کہیں گی۔ بوڑھی عورتیں رینگ کر دہلیز پر آ بیٹھیں گی۔ غرض کہ تمام محلے کا محلہ جذبہ ہمدردی اور تحقیقات سے چھلکنے لگے گا۔

KitaabPoint.blogspot.com

بات صرف اتنی تھی کہ شام کو میں جو بازار سے لوٹا تو سیڑھیوں میں کھلنے والے غسل خانے کی کنڈی باہر سے چڑھا آیا۔ اوپر پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ حفیظ بیٹھا پڑھ رہا ہے۔ میں نے ویسے ہی پوچھا کیوں میاں پڑھ رہے ہو؟ حفیظ پر مغربی رنگ اس قدر غالب تھا کہ وہ مشرقی شوق تحقیق کی عظمت کو قطعی طور پر نہیں سمجھتا بولا "نہیں شطرنج کھیل رہا ہوں۔" "لاحول ولاقوۃ" میں نے کہا تم تو پڑھ رہے ہو۔ بھلا پھر پوچھنے کا مطلب "اصل میں اس کی تربیت صحیح طریقہ پر نہیں ہوئی۔ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ نظر آتا ہے لازمی طور پر وہی حقیقت ہے۔ سیدھی سی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اگرچہ کتاب سامنے رکھ کر آپ پڑھ بھی سکتے ہیں مگر خواب بھی دیکھ سکتے ہیں کھلی آنکھوں کے باوجود اونگھ بھی سکتے ہیں بلکہ سامنے کتاب کھلی ہوئی ہو تو اونگھنے اور خواب دیکھنے کا عمل تسلی بخش ہوتا ہے۔ پاکستانی ظاہریت کے ڈھونگ کی حقیقت کو "کماحقہ" سمجھتے ہیں مگر حفیظ سے مغرب زدہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستانی بے معنی سوالات کرنے کے عادی ہیں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ بات صرف اتنی تھی کہ میں نے باہر سے نچلے کمرے کی کنڈی لگادی کچھ دیر کے بعد نیچے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی مجھے سے نیچے دیکھا تو کوئی بھی نہیں تھا اور دروازہ ہے کہ مسلسل کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ مجھے ایسی باتوں سے قطعی دلچسپی نہیں جو میری سمجھ میں نہ آئیں۔ میں نے ویسے ہی نیچے جانے والی سیڑھیوں کی کنڈی چڑھا دی اور حفیظ سے کہا بھئی کیا تماشا ہے کہ نیچے کوئی نہیں دکھائی دیتا لیکن نچلا دروازہ آپ ہی آپ بج رہا ہے۔ اس نے گویا میری بات ہی نہ سنی اور دو ایک انگڑائیاں لیں اور رضائی میں لیٹ گیا۔

اتنے میں محلے والے جاگ پڑے آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ مقابل کے گھر والی بولی "میں کہتی ہوں ان کے نچلے کمرے میں کوئی ہے" پہلو والے مکان والی کہنے لگی "چاہے کوئی ہے یا نہیں پر آواز وہیں سے آتی ہے" "میں جانوں کوئی بھی ہو پر ضرور ہے کوئی" سامنے گھر والی نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا۔ "عجیب سی آواز ہے" چوگان میں چارپائی پر پڑے ہوئے گوجرنے گویا پاس بندھی ہوئی بھینس سے کہا "عجیب سی آواز تو ہوگی۔" پہلو والے مکان والی بولی۔ "کیوں نہ ہو عجیب' عجیب تو ہوگی' زمینی آواز جو ہوئی" گجری دہلیز پر آبیٹھی "ہاں بہن یہ اللہ مارا کمرہ ہی سخت ہے" حفیظ نے منہ رضائی میں لپیٹ لیا۔ راہ گیر چلتے چلتے رک گیا۔ "کچھ نہیں گوجر نے بے پروائی سے کہا۔ کمرے میں سے یوں آوازیں آتی ہیں جیسے کوئی برات اتری ہوئی ہو۔" "میں کہتی ہوں ضرور کوئی ہے کمرے میں" مقابل والے مکان والی چلا کر بولی "اگرچہ کمرے میں کوئی نہیں" راہ گیر نے شور مچا دیا۔ "تو میاں جمعرات کو دیا جلاتا ہے۔" "کہاں جلانا چاہیے دیا" "میں کہتی ہوں اللہ تمہارا بھلا کرے ہے ضرور کوئی اس کمرے میں" مقابل والی نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "ہاں ہاں بھئی ہے تو ضرور" راہ گیر بولا۔ ٹھیک ہے۔ بوڑھا گنگنانے لگا۔ پر میاں ہے کوئی زبردست پھر بچوں نے والدین سے پوچھنا شروع

KitaabPoint.blogspot.com

کردیا۔ ''کون ہے اماج؟'' کیا ہے چچا۔ غرض سارا محلہ شوق تحقیق سے بھڑوں کے چھتے کی طرح بھنبھنانے لگا۔ صرف میں اور حفیظ چپکے پڑے تھے میں خیر ایک ضروری موضوع پر سوچ رہا تھا اور عادت ہے کہ منہ ڈھانپ کر سوچتا لیکن حفیظ اگرچہ اس کا بیان ہے کہ اس کی طبیعت ناساز تھی خیر۔

اگلے دن ہم بیدار ہوئے تو سامنے والی چھاتی پر ہاتھ مار مار کر کہہ رہی تھی ''میں نے کہا نہ تھا کہ کوئی ہے نچلے کمرے میں۔ میں تو پہلی آواز پر جان گئی تھی۔ کہ ہو نہ ہو کوئی ہے ضرور۔ ضرور ہے میں نے کہا۔ پر مجھے کیا معلوم کہ اپنا غلام محمد ہے پانی ہی لینا تھا۔ تو بازار کے نل سے لے آتا۔ اندر جانے کی کیا ضرورت تھی۔ بس کسی نے باہر سے کنڈی لگادی اندھے ہیں لوگ اندھے پر میں نے فوراً جان لیا کہ کوئی ہے ہاں۔

یہ شوق تحقیق ہمارا خصوصی امتیاز ہے اور شوق تحقیق کی عظمت کہ کون کافر نہ مانے گا؟ ضرورت ایجاد کی ماں سہی لیکن شوق تحقیق تو بیک وقت علم انکشاف ایجاد اور ضرورت کا باپ ہے۔ سنا ہے پرانے زمانے میں ایجادات ضرورت کے مطابق ہوئی تھیں لیکن اب نئی ایجاد نئی ضروریات پیدا کرنے کے لئے از بس مفید ثابت ہوتی ہیں۔ آپ وٹامن ''غ'' ایجاد کریں۔ تو جلدی ہی مجھ سے کئی ایک شرفاء جو اخبار کے اشتہار پڑھنے کے شوقین ہیں اپنے جسم میں وٹامن ''غ'' کی کمی شدت سے محسوس کرنا شروع ردیں گے۔ چونکہ تحقیق ایجادات پیدا کرتی ہے اس لئے پاکستان علم اور تہذیب کا گہوارہ بنا رہا اور آج بھی ہے۔

مغربی ممالک میں شوق تحقیق تو ہے لیکن نہ تو وہ اس قدر عام ہے نہ اتنا شدید وہاں یہ شو چند ایک افراد پر محدود ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تحقیق کا میدان اس قدر وسیع نہیں۔ وہ صرف بے جان چیزوں اور ان رینگتے ہوئے کیڑوں پر محدود ہو چکا ہے۔ جنہیں آج تک کسی شریف آدمی نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ پھر مشینوں کی بات پر اعتبار کر لینا انسانی توقیر کو برباد کر دینے کے مترادف ہے۔ مشینیں جو زمین سے آسمان کے قلابے ملانے میں اس قدر تیز ہیں جو تصویروں کو چلتے پھرتے بولتے چالتے دکھانے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ حالانکہ یقین جانئے یہ محض جھوٹ ہے۔ سفید جھوٹ خیر مانا کہ چیزوں کی تحقیق بھی معمولی بات نہیں مگر انسانی تحقیق اللہ اکبر کیا بات ہے انسانی تحقیق کی۔

انسانی تحقیق کا شرف صرف اہل مشرق کو حاصل ہے خدا اور انسان سے کمتر مخلوق کو اپنے شوق تحقیق کا موضوع بنانا ہمارے شایان شان نہیں پرانے زمانے میں ہمارا شوق تحقیق خدا پر مرکوز تھا اور آج کل انسان پر مرکوز ہے اور یہی وصف اس کی عظمت کا شاہد ہے۔ حاسدوں کا کہنا ہے کہ ایسی تحقیق بے مصرف ہے۔ اول تو یہ محض تاجرانہ نقطہ نظر ہے چونکہ علم ایجاد کا اور ''تصرف'' کی حدوں سے

KitaabPoint.blogspot.com

بلند تر واقع ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کوئی طریق کار جس سے نتیجہ کے طور پر بجلی انڈہ یا وٹامن اب ت پیدا نہ ہو سکے بے کار ہے چونکہ ایسی چیزیں بنی نوع انسان کے لئے مفید ہوتی ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا جذبہ تحقیق تو براہ راست انسان سے تعلق رکھتا ہے۔ بجلی کے انڈے کی طرح ضمنی طور پر نہیں۔

ہندی تحقیق نے بنی نوع انسان پر ان گنت احسانات اور انکشافات کئے ہیں ان سب سے بڑا انکشاف خدا ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ خدا ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔ قطعی طور پر درست ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ یہاں خدا کی وضاحت اور تکمیل عمل میں آئی۔ اسے مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا گیا اور بال آخر پتھر میں واضح اور محفوظ کر دیا گیا۔ اس کے مختلف روپ اور خصوصیات سونے چاندی اور دھاتوں میں اجاگر کر دیئے گئے۔ اس کے اولتے بدلتے موڈ کی مناسب اشکال مرتب کی گئیں۔ یعنی خدا کے بارے میں کوئی تفصیل ایسی نہ رہی جس کی چھان بین نہ کی گئی ہو۔

یہ ہندی جرات اور پرواز خیال ہی کا کمال ہے کہ انہوں نے آنکھ موندھ کر دیکھنے کا نظریہ پیدا کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ خدا جو ہر جگہ موجود ہے۔ اس کی جگہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تلاش کرنا حماقت ہے' یہ ہندی ذہن کا کمال ہے کہ ایسا ذریعہ حصول دکھائی دیتا ہے آنکھ موندھ کر چشم بینا پیدا کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔

آج پاکستان اور ہندوستان میں تحقیقی سرپٹ جوں کی توں قائم ہے اگرچہ آج کل خدا کی بجائے وہ انسان پر مرکوز ہے۔ آپ دفتر سے لوٹتے ہیں تو بیگم کو اپنا منتظر پاتے ہیں۔ آپ کے سامنے کھانا چن کر وہ اطمینان سے بیٹھ جاتی ہے اور آپ کو پنکھا کرنے لگتی ہے۔ پھر محلہ کی تازہ خبریں پنکھے کی ڈنڈی کے محور پر رقص کرنے لگتی ہیں۔ آپ نے سنا اس نوجوان سی بھنگن سے اس غنڈے بابو نے کیا کیا؟ اسے بھی کو لیے مٹکائے مٹکائے بنا چین نہ آتا تھا۔ آنکھ میں کاجل کی دھار' باریک دوپٹہ' اور اللہ ماری تھرکتی ہوئی چھاتیاں تو یہ ہے اور وہ چوبارے والی منکو ہر آتے جاتے کو دیکھ کر مسکراتی تھی۔ اس کی کرتوت بھی کھل گئی۔ اپنے سقے سے گٹھی ہوئی ہے۔ رحیم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے انہیں کیا زمانہ آیا اور مسجد کا ملا جو ہے۔ اگر آپ کامیاب خاوند بنا چاہتے ہیں تو ہر بات میں "ہیں؟" "وہ چوک میں رہتی ہے؟ لاحول ولا قوۃ کہتے رہئے اور تھرکتی ہوئی چھاتیوں والی بھنگن' آنکھیں مٹکاتی ہوئی چوبارے والی پر لاحول بھیجتے رہئے۔ ورنہ آپ کا بھی حشر وہی ہوگا جو میرا ہوا ہے اور خدا گواہ ہے کہ ایسا حشر محشر سے کم نہیں۔ ایک روز جب پنکھے کی ڈنڈی کا محور رقص میں تھا بیگم بولی۔ "سنا آپ نے اپنی دھوبن صاحب کے خانساماے سے گھٹی ہوئی ہے" اور میں نے سمجھدار خاوند کی طرح "ہیں" "کیا؟" کہنے یا لاحول پڑھنے کی بجائے ہنس کر کہہ دیا۔ بھئی واہ جب تو اچھے اچھے کھانے کھاتی ہوگی بسکٹ' کیک' آملیٹ اور کیا کیا۔ بڑی

KitaabPoint.blogspot.com

سمجھدار ہوگئی۔ بیگم کھسیانی ہوکر خاموش ہوگئی۔ اور پھر غالباً وہ بھی سمجھدار ہوگئی۔ گھروں میں پنکھوں کی ڈنڈیوں کے محور پر ہماری باتیں رقص کرنے لگیں۔ ''ہیں'' یہ جو تکونی منہ والا بابو ہے۔ ہاں ہاں' اس کی بیوی لاحول ولاقوۃ؟ نتیجہ یہ ہوا کہ بیگم۔ خیر چھوڑیئے نتیجہ کو نتیجے تو عام سے ہوتے ہیں اور بات بھی خاص نہیں ہوتی۔ صرف ہنگامہ ہوتا ہے اف کس قدر ہنگامہ ہوتا ہے۔

پاکستانی تحقیق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ظاہریت کو خاطر میں نہیں لایا جاتا۔ آپ اپنے گھر میں داخل ہوتے ہیں معاً کوئی نہ کوئی بول اٹھتا ہے۔ ''آ گئے سجاد'' آپ کا بظاہر آ جانا اس قدر کافی نہیں کہ اس امر کو تسلیم کر لیا جائے کہ آپ واقعی آ گئے ہیں اگر آپ جواب میں نہیں کہہ دیں تو گھر والے آپ کے بیان کو جھٹلائیں گے نہیں۔ بلکہ معاملہ زیر غور آ جائے گا۔ فرض کیجئے۔ آپ نہا رہے ہیں غسل خانے میں گڑوی پہ گڑوی انڈیلنے کی آواز آ رہی ہے۔ سارا گھر اووادوکی کانپتی ہوئی آواز سے گونج رہا ہے لیکن کوئی نہ کوئی غسل خانے کے دروازے پر آ کھڑا ہوگا اور پوچھے گا۔ ''نہا رہے ہو سجاد'' آپ کی مرضی ہے کہ ہاں کہہ کر اسے مطمئن کر دیں یا کہہ دیں۔ ''صاحب'' دھوپ سینک رہا ہوں۔ اہل مغرب کا خیال یہ ہے کہ پاکستانی بے کار باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ کس قدر غلط فہمی پر مبنی ہے' لیکن جو ظاہریت کے سہارے جی رہے ہوں وہ بے چارے کیا سمجھیں گے۔

علم و ایجاد کے علاوہ شوق تحقیق اس انسانیت بھرے جذبہ کی تخلیق کرتا ہے جسے ہمدردی کہا جاتا ہے ظاہر ہے کہ اگر آپ کسی کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہ ہوں تو آپ اس سے کیسے ہمدردی محسوس کر سکتے ہیں؟ تو ہمدردی محسوس کرنے سے پہلے تحقیق لازم ہوئی۔ پاکستان میں چاہے کوئی پاٹے خان بن کر رہنے کی کوشش کرے جلد ہی لوگ تحقیق کے زور سے اس کی ''پاٹے خانیت'' کی تہ تک پہنچ جائیں گے۔ پھر کوئی نہ کوئی کہہ دے گا۔ ''بے چارہ پاٹو'' بھلا چنگا آدمی ہے بس ذرا سی چونے گزی ہے اور معاً ان سب کا جذبہ ہمدردی جوش میں آ جائے گا۔

کئی اصحاب کا خیال ہے کہ یہ جذبہ ترس کے مترادف ہے اور ترس میں نفرت کا عنصر ضروری ہے۔ مانے لیتے ہیں لیکن نظر غائر سے دیکھا جائے تو یہ جذبہ ''رسمی ہمدردی'' سے بھی زیادہ کارآمد اور ہمدردانہ جذبہ ہے چونکہ نتیجہ کے طور پر مفعول سے ہمدردی پیدا کرنے کے علاوہ فاعل کی اہمیت اور اطمینان کا احساس دلاتا ہے۔ آپ کسی کو تحسین و احترام بھری نگاہ سے دیکھیں گے۔ معاً وہ شخص آپ پر حرام ہو جائے گا۔ یعنی اس کی شخصیت عظیم تر ہو جائے گی۔ اور آپ کی شخصیت سمٹ سمٹ کر معدوم ہونے لگی گی۔ نتیجہ کیا ہوگا؟ دنیا میں انسانی مساوات قائم نہ رہے گی اور پھر میل جول کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یعنی ہماری مجلسی زندگی تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ اس کے برعکس چاہے وہ شخص ''نواب'' ہی کیوں نہ ہو آپ ایک مرتبہ اسے سچے دل سے بے چارہ کہہ دیں معاً اس کے موٹر' محل اور کلغی آپ

KitaabPoint.blogspot.com

کی نگاہ میں کھلونے بن کر رہ جائیں گے۔ آپ کے دل میں اس قدر رواداری پیدا ہو جائے گی کہ آپ نظر بھر کر اس کی طرف دیکھ سکیں گے۔ بس اتنی سی بات سے ایک احساس ہمسری پیدا ہو جائے گا اور آپ کو اس کے موٹر اور محل پر کوئی گلہ نہ رہے گا۔

پاکستانی خیال کا یہ سب سے بڑا معجزہ ہے کہ موٹر محل اور کلغیوں کو فرد حلت قرار دے کر امیر اور غریب کو شانہ بشانہ لا کھڑا کیا ہے۔ اتنی سی بات غریبوں کے لئے زندگی جینے کے قابل ہو گئی ہے۔ اس کے برعکس مارکس نے ان اہل امتیازات کا رونا رو کر دونوں میں وہ بعد پیدا کر دیا ہے کہ نہ جانے اس کی سلگائی ہوئی آگ کب تک بھڑکتی رہے گی۔

انسان تو ایک طرف رہا' اہل ہند نے خدا سے ہمدردی اور محبت کے جذبات بیدار کرنے کی نیت سے اسے ایسے روپ عطا کر دیئے ہیں جنہیں دیکھ کر اس کی عظمت محسوس کرنے کے علاوہ فرط محبت سے بے تاب ہو کر آپ کا جی چاہتا ہے کہ اسے گلے لگا کر رو پڑیں۔ آپ احترام ضرور محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ احترام کا احساس اسے آپ پر حرام نہ کر سکے گا۔ بلکہ مجسمہ کو دیکھ کر آپ کو محسوس ہو گا کہ وہ بھی آپ کی طرح معذور ہے' لاچار ہے۔ اس بات پر یہ کہہ دینا کہ اہل ہند نے خدا کو کارٹون بنا رکھا ہے۔ لاحول ولاقوۃ یہ کہنے والے کے غور و خوض کے فقدان ان کا شاہد ہے چونکہ ہندوستانی نقطۂ نگاہ اشکال و ہیت جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ہمارے گاؤں میں چند انگریز نما لوگ کچھ دنوں کے لئے آ مقیم ہوئے۔ پہلے دو ایک دن تو گاؤں والے اپنے اپنے جوتوں میں کھڑے تعجب سے ان کی طرف دیکھتے رہے اور گاؤں کے کتوں کی بھی سمجھ میں نہ آیا کہ انہیں دیکھ کر بھونکیں یا محض دم ہلانے پر اکتفا کریں۔ پھر اللہ اس کا بھلا کرے نمبردار نے ایک ہی وار میں اس حیرت و تعجب سے پیدا شدہ امتیاز کو توڑ دیا بھرے دارے میں بولا۔ "بے چارے چھری کانٹے بغیر کھا نہیں سکتے" اس بات پر معاً فضا کو مکدر کرنے والے بادل اڑ گئے۔ ہر کوئی "تت' تت' تت' بے چارے" کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چند گھنٹوں میں یہ بات بچے بچے کی زبان پر تھی۔ لوگ چل کر گئے اور از سر نو ان اجنبی بے چاروں کو دیکھ کر اور بھی تت' تت کرتے ہوئے لوٹے۔ گاؤں والے ہمدردی سے بے تاب ہو رہے تھے ہر کسی کا جی چاہتا تھا کہ انہیں ساگ اور مکی کی روٹی پیش کرے۔ جس پر گھی تیر رہا ہو۔ لسی کا کٹورا پلا کر ان کے سر پر ہاتھ پھیرے اور خوشی خوشی گھر چلا آئے پھر کسی کے سوال پر کوئی بولا۔ "ارے جمعو کرے نہیں یہ تو ٹوپیاں ہیں پیچھے والی تاکہ دھوپ نہ لگے" "دھوپ نہ کاٹے" "جمعہ کھار ہنسا" "چودھری جی دھوپ نہ ہوئی بچھو ہوا" حد ہو گئی بے چارے دھوپ نہیں سہ سکیں۔ تو مہاراج! موجا جام نے کہا "تو لے لیویں دو پٹے" کیوں نہ مہاراج! اس بات پر ان کی رہی سہی "پالے خانیت" بھی نکل گئی۔ پھر تو گاؤں کے کتوں نے بھی انہیں بھونکنا ترک کر دیا اور لسی کے کٹورے اور ساگ روٹی سبھی کچھ انہیں پہنچنے لگا۔ گاؤں والوں کی ہمدردی کا یہ عالم تھا کہ ہر کسی کا جی چاہتا تھا کہ انہیں

KitaabPoint.blogspot.com

کھانا کھلائے اور دارے میں دھوپ میں بیٹھ کر گنے چوسائے۔

ہمدردی محض اکہرا جذبہ ہے' کسی سے ہمدردی محسوس کی اور بس قصہ ختم پھر ضروری نہیں کہ وہ عملی صورت بھی اختیار کرے۔ بسا اوقات ہمدردی جذبہ کی رو بن کر آتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ آپ چاہے کسی سے ہمدردی محسوس کر کے دیکھ لیں۔ اس بات کا آپ کی اپنی ذات پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ آپ جیسے تھے ویسے ہی رہ جائیں گے۔ تیسرے کسی بڑی شخصیت یا امیر آدمی سے ہمدردی محسوس کرنا ممکن نہیں چونکہ اس کے اور آپ کے درمیان بعد سا محسوس ہوتا ہے تو اس میں یہ بات نہیں۔ آپ ہفت اقلیم کے بادشاہ پر بھی ترس کھا کر اسے انسانیت کا مرتبہ عطا کر کے اپنا ہمسر بنا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس جذبہ نیک سے آپ کی اپنی شخصیت بھی ابھر آتی ہے۔ آپ اپنے آپ کو کسی سے کمتر محسوس نہیں کرتے اور آپ کو لوگوں کی دولت یا امارت یا حیثیت پر گلہ نہیں رہتا۔

کون نہیں جانتا کہ دنیا جبھی تک قائم ہے جب تک اس میں آپ کی ایک حیثیت ہے' آپ کی اپنی حیثیت نہ ہو۔ تو گرد و پیش ایک بے معنی پھیلاؤ بن کر رہ جائے۔ ڈراؤنا بھیانک پھیلاؤ۔

آپ تو خیر سمجھدار ہیں۔ لیکن ایسے اصحاب بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ پاکستانی ہمدردی کا یہ عالم ہے تو پھر پاکستان میں غربت اور دکھ کا وجود کیوں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں ہمدردی کا عنصر زیادہ ہوگا۔ وہاں دکھ بھی عام ہوگا۔ ظاہر ہے جو چیز باعث توجہ سمجھی جائے وہ عام ہوگی۔ کیونکہ ہر کوئی توجہ حاصل کرنے کا مشتاق ہے۔ اہل پاکستان کے فقیروں کی تعداد اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ غربت زدہ ملک ہے۔ بلکہ اس بات کا کہ اہل پاکستان ہمدردی زدہ لوگ ہیں اور اس بات پر مصر ہیں کہ ان کے جذبہ ہمدردی کو ابھارا جائے۔

پاکستان نے اس حقیقت کو پالیا ہے کہ آپ سے مانگنا آپ کو احساس برتری دینے کے مترادف ہے۔ ''بابو ایک پیسہ'' آپ کے سامنے ایک بھکاری آ کر چلاتا ہے۔ معاً آپ کی ایڑیاں اٹھتی ہیں۔ آپ نیچے نگاہ ڈال کر دیکھتے ہیں۔ کیا دیکھتے ہیں آپ کہ ایک بے چارہ آپ سے بھیک مانگ رہا ہے۔ معاً آپ اوسط درجہ کی حیثیت کو چھوڑ کر بڑی حیثیت والے بن جاتے ہیں۔ ''بھاگ جا بے'' آپ دور سے چلاتے ہیں۔ سالے نہ کام نہ کاج مانگنے کا چسکا پڑا ہوا ہے۔ ''یہ لے'' آپ ایک اودھنی پھینکتے ہیں۔ خبردار جواب پیچھے آیا میرے' خواہ مخواہ شرفاء کو تنگ کرتے پھرتے ہیں۔ یہ کہہ کر آپ شرفاء کی سی چال سے خراماں خراماں آگے چل پڑتے ہیں۔

اہل پاکستان نے اس نکتہ کو سمجھ لیا ہے کہ زندگی غم خواری سے بہتر عشرت پیش نہیں کر سکتی۔ اگر وہ دکھی کی مدد نہیں کر سکتے تو صرف اس لئے کہ دکھ کو زندگی سے خارج کر دیا جائے تو احساس' ہمدردی' خدا کا ڈر اور تشکر کے جذبات جو ہر کو حرکت میں لے آتا ہے اور یہی چیز زندگی ہے۔ خوشی میں ایسا جذباتی تحریک پیدا کرنے کی اہلیت بھی ہو۔ اہل پاکستان نے غم کی فوقیت کو بنی نوع انسان میں سب سے

KitaabPoint.blogspot.com

پہلے منکشف کیا۔ اگرچہ بعد میں عیسائیت نے بھی غم خواری کی عظمت کو اجاگر کیا' لیکن اہل مسیح اس نکتہ کو نہ سمجھ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تفریح کے سمندر میں غوطے کھا رہے ہیں اور دور کنارا ان کا منہ چڑا رہا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے لئے "ہر موج کنارا ہے"

پاکستان میں آپ جو جی چاہیں کریں۔ چاہے چھری کانٹے سے کھائیں یا غریبوں کا خون چوسیں۔ آپ کے شغل میں کوئی مزاحم نہ ہوگا۔ بشرطیکہ آپ ایسے عمل کو ایسے طریقہ سے سرانجام دیں جو ہمارے شوق تحقیق کو چیلنج نہ کرے اور نہ اسے ٹھیس لگانے کا باعث ہو۔ لیکن آپ نے کوئی ایسا کام کیا یا ایسے انداز سے کیا جس سے ہمارا شوق تحقیق مشتعل ہو یا اسے عاجز کرنے کی کوشش کا اظہار ہو تو تحقیق آپ نے گناہ کیا اور ہمارے لئے گناہ سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں۔

ہمارا احساس گناہ براہ راست آسمانی شہادت سے اخذ کیا گیا ہے اور کلیتہً اسی پر مبنی ہے۔ کہتے ہیں اللہ تعالے نے اندھیرے' اجالے' خشکی' پانی الگ الگ کر کے آدم کی تخلیق کی۔ جس کی پسلی سے عورت پیدا ہوئی۔ "جبھی وہ آج وہیں مدفون ہونے کے لئے بے تاب و بے قرار پھرتی ہیں تحقیق ہر چیز اپنی اصلیت کی طرف رجوع کرتی ہے۔" لیکن مرد اور عورت ابلیس سمیت اس قدر کافی نہ تھے کہ ایک جہاں آباد کر سکتے۔ تو صاحب ممنوع پھل پیدا کیا گیا۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بے مصرف و بے کار پیدا نہیں کی۔ بس پھر کیا تھا' باقی کام عورت نے نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ "جیسے آج کل بھی وہ جملہ کام خوش اسلوبی سے سرانجام دینے سے ذرا غافل نہیں ہوتی۔ مرد ہو' عورت ہو اور شیطان اور آپ نتیجہ کے لیے عورت پر کامل بھروسہ کر سکتے ہیں" نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دل فریب جہان وجود میں آ گیا۔

اہل پاکستان لوگوں کی باتوں کو اہمیت نہیں دیتے۔ وہ صرف خدا کے قائل ہیں اس لئے یہاں گناہ صرف ممنوع پھل کھانے کے مترادف ہے۔ باقی غریبوں کا خون چوسنا' مزدوروں کے سر پر اپنے محلات کی بنیاد رکھنا' مذہب کی آڑ لے کر لوگوں کو لوٹنا' ان باتوں کا مضائقہ نہیں لیکن چوری چوری کسی عورت سے تعلق جو کسی کی ملکیت ہو کیا چاہے ہر خاص و عام کا کھلونا ہو۔ یہ بات یہاں نہ چلے گی اور ہوں نہیں چلے گی۔ چونکہ یہ گناہ ہے ہم ظلم سہہ سکتے ہیں مگر گناہ برداشت نہیں کر سکتے چونکہ دنیا میں گناہ سے بڑی کوئی چیز نہیں۔ اگر گناہ کرنا ہی ہے تو چھپ کر کیجئے تاکہ پاکستانی شوق تحقیق کی عظمت قائم رہے۔

تحقیق کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہر ایسے ویسے بچہ کو جس کی پیدائش کا راز تحقیق طلب ہے۔ "لطفہ بے تحقیق" کہا جاتا ہے اور اسے ہمیشہ کے لئے مشکوک نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ خیر یہ تو انسانی زبان ہے۔ مقدس کتابوں میں اللہ میاں نے بار بار یہ لفظ دہرا کر اس کی عظمت کا اظہار اپنی زبان سے فرمایا ہے۔ "تحقیق عورت کے لئے سنگار کے ذریعہ اپنے جسم کی نمائش کرنا گناہ ہے"

KitaabPoint.blogspot.com

تحقیق ان لوگوں کے دل پر ہم نے تالے لگا دیئے وہ کہتے ہیں پر نہیں سمجھتے دیکھتے ہیں پر نہیں دیکھتے۔ تحقیق اس انداز بیان کا فائدہ ہے کہ مزید تحقیق کی ضرورت نہیں رہتی اور ہمارا کام صرف یہ رہ جاتا ہے کہ آنکھیں بند کر کے ایمان لے آئیں۔

اہل پاکستان تحقیقی قابلیت کو تحسین واحترام بھری نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسی لئے یہاں ہر جگہ اراکین محکمہ پولیس کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اوران کا احترام کیا جاتا ہے۔ اس محکمہ کا کوئی رکن عام کسی گاؤں میں چلا جائے لوگ اپنے شغل چھوڑ کر عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے اس کے گرد جمع ہوجاتے ہیں ان کا جی چاہتا ہے کہ اس پر نثار ہوجائیں سب کچھ اسے سونپ کر آپ فقیر ہوکر ویرانے میں جا بیٹھیں پاکستان کی بات کیا دنیا بھر میں پاکستان کے اس محکمہ کا بڑا نام ہے۔ اس کی شہرت بین الاقوامی ہے۔ تمغے ملتے ہیں۔ اعزازی گزٹ میں نام چھپتا ہے اور اعزازی فیتے کوٹ پر لگانے کو ملتے ہیں۔

مجھے ایک دفعہ کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ اف! تعجب ہے کہ وہ شہر کوئٹہ کی طرح غارت کیوں نہ ہوا۔ میں متواتر چار دن ادھر ادھر گھومتا رہا' لیکن بے کار نہ تو کسی نے آنکھ اٹھا کر میرے نئے سوٹ کی طرف دیکھا نہ کوئی عورت منہ میں انگلی ڈالے حیرت سے کھڑی کی کھڑی رہی' نہ کسی کو احساس ہوا کہ یہ میں ہوں۔ میں قدیم پورہ کا قدرت اللہ ہوں۔ جمعدار چودھری اسداللہ کا بیٹا جنہیں ڈیڑھ مربع زمین انعام ملی تھی۔ کسی نے اتنا نہ پوچھا کہ میاں کون ہو تم اف وہ شہر بس صاحب چوتھے روز میں نے قدیم پورہ میں آ کر دم لیا اور جب قصبہ کے حجام نے جھک کر سلام کیا اور بولا آ گئے چھوٹے میاں دیکھ آئے کراچی تو مجھے یقین آیا کہ میں بھی ہوں اور میں چودھری کا بیٹا ڈھوں چودھری کا۔

اگرچہ تحقیق کرنے میں میں بالکل کورا ہی' لیکن عالم ہونے کی حیثیت سے مجھے فوراً معلوم ہوجاتا ہے کہ میرے متعلق تحقیق کی جا رہی ہے۔ ایسے وقت میں بھی متاثر ہوجاتا ہوں اور اپنے پاؤں کی طرف دیکھتا ہوں۔ چال میں اور بھی جاذب توجہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ نہیں مناسب مقام پر لٹکا دیتا ہوں۔ پتلون کی جیب میں یا کہیں اور یا انہیں صحیح طور پر چلاتا ہوں۔ یعنی جب بازار میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے لوگ یا دکان پر کھڑے محققین میری طرف دیکھتے ہیں تو میں خود بھی اپنی طرف دیکھنے لگتا ہوں۔ ایک ساعت کے لئے دنیا میرے سوا تمام مخلوق بے معنی اور بے حیثیت ہوجاتی ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں صرف میری شخصیت کی قندیل منور ہوتی ہے اس وقت گویا میں اپنے آپ کو جان لیتا ہوں کہتے ہیں کہ خدا کو جاننے سے پہلے اپنے آپ کو جاننا ضروری ہے۔ یہ بات تو اہل مغرب بھی مانتے ہیں۔ (KNOW THYSELF) تو ظاہر ہے ہمارا شوق تحقیق خدا کو جاننے میں مدد دینے کے لئے بے حد مفید ثابت ہوتا ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

کوئی دوراہ گیر عورتیں تانگے میں یا پیدا چلتے ہوئے منہ یا کان جوڑ کر بات کریں تو معاً مجھے علم ہو جاتا ہے کہ میرے متعلق استفسار ہو رہا ہے یہ صلاحیت عام نہیں بلکہ خدا کی دین ہے۔ ورنہ سڑکوں پر دیکھ لیجئے۔ کئی اللہ کے بندے ی وں مارے مارے پھر رہے ہوتے ہیں یا بھاگے بھاگے جا رہے ہوتے ہیں۔ گویا چابی والے کھلونے ہوں یا جیسے ان کا ہر منٹ زر ہو۔ اصل میں تمام تر قصور مغربیت زدگی کا ہے۔ مصیبت ہے یہ کہ ہمارے جملہ مصائب مغربی ضرب الامثال پر یقین لے آنے کا نتیجہ ہے۔ غور کیجئے اگر آپ (TIME IS MONEY) پر ایمان لے آئیں تو کیا ہو؟ یہاں کے جملہ قصبہ جات کندن بن جائیں۔ نہ کوئی آپ کو جانے اور نہ اپنے آپ کو خدا کی بات ہی چھوڑیئے۔ شوق تحقیق صابن کی جھاگ کی طرح اڑ جائے گا اور پھر کیا نہ گناہ رہے اور نہ ثواب پھر وہ WORK WORSHIP کا سفید جھوٹ۔ اس سے بہتر نظریہ تو ہمارے بزرگوں نے ایجاد کیا تھا۔ ''فاقہ عبادت ہے۔'' لیکن اہل مغرب نے ہم سے کام لینا تھا نا۔ ورنہ یہ ریلیں' نہریں' کارپوریشن اور جملہ محکمہ جات کیسے وجود میں آتے۔ تو صاحب انو ہس نے فاقہ کو کام میں بدل کر ہمیں عابد کا رتبہ دیا۔ فاقہ کی ہمت اور اہلیت پیدا کرنا گویا ابدی آزادی کی گارنٹی پیدا کرنے کے برابر ہے اور کام' کیسی عام چیز ہے۔ پھر مصیبت یہ ہے کہ وہ ڈھونڈے بنا ملتا نہیں بلکہ بسا اوقات ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ مل جائے تو آپ اپنے ان داتا کے ہو رہتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا ئماتا کہ ''ہندی ذات پات'' نے امتیازات پیدا کئے۔ لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے بنی نوع انسان سے فریب کاری یا جھوٹ روا رکھا یا اپنی مطلب براری کی۔ REACHING IS THE NOBLEST PROFESSTON تو واقعی ایک حقیقت ہے ورنہ میں یہ پیشہ کبھی اختیار نہ کرتا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ سنہری ضرب المثل صرف سکولوں کے کمروں ہی میں ٹنگی ہوئی پائی جاتی ہے۔ کچہری' پولیس چوکی' اور تحصیل میں نہیں۔ حکام کی بے توجہی اور بے پروائی کی وجہ سے یہ سنہری ضرب المثل کرسی معلی کے سامنے آویزاں ہونے سے بھی محروم رہے۔ یہ خیال آتا ہے تو دل کانپ اٹھتا ہے۔

نکتہ چین کا خیال ہے کہ اہل پاکستان کا جنسی تعلق کو اس قدر اہمیت دینا اور اسے اخلاقیات پر حاوی کر دینا زیادتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ کی پوری تحقیق نہیں کی۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ جنسی تعلق کی لذت کا اسی پر انحصار ہے کہ وہ پردہ میں ہو در پردہ میں رہے۔ شاید ہی کوئی ایسی قوم یا لوگ ہوں جنہوں نے زمانہ قدیم میں اعلانیہ ''جنسی تعلق'' کا تجربہ نہ کیا ہو۔ جہاں تک تاریخ شاہد ہے ہر ملک وقوم پر ایسا دور آیا۔ جب ''جنسی تعلقات'' کا آزادانہ اظہار مستحسن سمجھا جاتا تھا بلکہ لوگوں کے گروہ جنسی ہڑبونگ مچانے کے عادی تھے۔ پھر یہ رسم دیر تک قائم نہ رہ سکی اور مہذب ہونے کے ساتھ ساتھ لوگ پردہ پوش ہوتے گئے۔

ہماری تحقیق نے اس بھید کو پا لیا ہے اور اسی لئے ہم جنسی تعلق کے متعلق غافل نہیں ہوتے۔ اور یہ سب صرف اس لئے کہ مبادا

KitaabPoint.blogspot.com

جنسی تعلق کی لذت کم ہو جائے۔ اس لئے کہ آپ اور میں اپنے پوشیدہ جنسی تعلقات یا تجربات سے پورا حظ حاصل کر سکیں۔ ہم نے غم خواری اور تحقیق کی کلیاں ٹانک کر جنسی لذت کو وہ شدت اور قیام بخشا ہے کہ کیا کہیے۔ ورنہ یہ پاکیزہ تجربہ محض ایک ROUTINE بن کر رہ جاتا اور انارکلی ہائیڈ پارک بن جاتی جو چھپانے کا اعلان کرنے کے باوجود چھپا نہیں رہ سکتا اس پارک کا نام بذات خود پاکستانی نقطہ نظر کا حامی ہے۔ پھر بھی اہل مغرب نہ سمجھیں تو کوئی کیا کرے۔ وہ تو جانتے ہیں کہ STOLEN KISSES ARE SWEET یعنی چرائے ہوئے بوسے لذیذ ہوتے ہیں۔ اس بارے میں مشرقی عورت کے فن کو کون کافر تسلیم نہ کرے گا۔ یہ اسی کا کمال ہے کہ چاہے دراصل آپکو یہ احساس ہوگا کہ آپ نے زبردستی' قوت بازو سے یا چوری بوسہ لیا ہے۔ اہل مغرب کا مطلب تو صرف محبوب سے چوری ہے لیکن یہی چوری عوام سے بھی ہو اپنے گھر والوں سے بھی' پڑوسی سے بھی اور خدا سے بھی۔ تو کیا وہ بوسے لذیذ ترین نہ ہو جائیں گے۔ لیکن اہل مغرب اس نکتہ کو کیا سمجھیں گے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

پہاڑ

پہاڑوں کی حیثیت عورتوں کی سی ہے۔ ان کا اچھا برا ہونا صرف اس امر پر منحصر ہے کہ آپ وہاں کس مقصد سے جاتے ہیں اگر آپ کا مقصد صحت بنانا ہے تو کیا دیکھیں گے آپ کہ بیچارے پہاڑ صبح شام کی صحت بنانے میں مشغول رہتے ہیں اگ آپ اس خیال سے وہاں جائیں کہ مزے سے وقت کٹے گا تو وہ مسخروں کی طرح آپ کے گرد ناچنا شروع کر دیں گے اور آپ محسوس کریں گے کہ پہاڑ پر کوئی سنجیدہ کام ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر آپ کا مقصد قدرت کی بوقلمونیاں دیکھنا ہے تو آپ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر چاروں طرف دیکھنے میں کھو جائیں گے اور آپ کو محسوس کر کے مسرت ہوگی کہ قدرت کو بوقلمونیاں دکھانے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔ اگر آپ پہاڑ پر تپسیا کرنے جاتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ بھورکا سے ہے۔ درخت گیان دھیان کا آسن جمائے کھڑے ہیں۔ چوٹیاں آکاش کی طرف اشارہ کر رہی ہیں اور آکاش سے کوئی مسکرا کر دھرتی کی طرف جھانک رہا ہے لیکن اگر آپ کسی صاحب کے دفتر کے کلرک ہیں یا چنگی کے محرر ہیں اور آپ کا تبادلہ کسی پہاڑ پر ہو جاتا ہے خدا نہ کرے کہ آپ کو ایسا سانحہ پیش آئے۔ تو دفعتاً پہاڑ میں کئی ایک تبدیلیاں واقعہ ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ پہاڑ پہاڑ ہی نہیں رہتا۔

سیر کرنے کے لیے چاہے آپ کسی راستے پر نکل جائیں چاہے وہ سڑک ہو یا ڈنڈی ''آہا کیسی خوبصورت روش ہے چیل کے درخت کس خوبصورتی سے استادہ ہیں۔ ڈنڈی کس انداز سے گھومتی ہوئی جا رہی ہے۔ ابھی آپ منظر کی خوبصورتی سے پورے طور پر محظوظ بھی نہیں ہونے پاتے کہ کیا دیکھتے ہیں آپ کہ ڈنڈی گھوم پھر کر آپ کے دفتر کے سامنے آ نکلی ہے۔ دفعتاً آپ کی نگاہ کے سامنے دفتر کی عمارت پھیل جائیگی۔ خوبصورت روشیں' خوشنما درختوں کی قطاریں' آبشاریں' ندیاں' چشمے' پھول' سب دفتر کی عمارت کی اوٹ میں آ جائیں گے۔ پہاڑ ختم ہو جائے گا اور دفتر شروع۔ دفتر کی عمارت کی کھڑکی سے صاحب جھانکے تو آپ کی حیثیت محض کلرک کی رہ جاتی ہے اور دفتر کے ساتھ ساتھ جاتی ہوئی سڑک پر ٹہلتی ہوئی لڑکیوں پر شوق بھری نگاہیں ڈالنے کے بجائے آپ نہ جانے کیوں ان سے جھینپنا شروع کر دیتے ہیں۔ سڑک پر ٹہلتی ہوئی لڑکیوں کا کا یک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ صاحب کی توجہ آپ کی طرف نہیں رہتی اور بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ایک کلرک کے لیے یہ بڑی نعمت ہے۔

یقین جانیے پہاڑ کی سڑکوں پر گھومتی پھرتی لڑکیاں بڑی چیزیں ہیں۔ آپ کہیں گے ان کا کیا ہے وہ تو ہر شہر میں گھومتی پھرتی پائی

KitaabPoint.blogspot.com

جاتی ہیں۔ مان لیتے ہیں لیکن اگر آپ ان کے لاہور میں گھومنے پھرنے اور مری میں گھومنے پھرنے کا فرق نہیں سمجھتے تو تحقیق آپ کو سمجھانے کی کوشش بے سود ہے۔

لاہور میں انہیں گھومتے پھرتے دیکھ کر آپ محسوس کریں گے کہ وہ دفتر جارہی ہیں یا گھر کو لوٹ رہی ہیں۔ بازار میں ٹہلتے دیکھ کر آپ سمجھیں گے کہ گھر کے لیے خرید وفروخت کر رہی ہیں یا تو پکوڑے تلنے کے لیے کڑاہی خریدنے کے فکر میں یا بچے کے لنگوٹ کے لیے پن' مال روڈ پر ٹھہر رہی ہوں تو بھی آپ کو یوں دکھائی دے گا جیسے آتی جاتی موٹروں سے بچ کر نکلنے کی کوشش میں لگی ہیں۔ لیکن مری پر وہ صرف ٹہلتی ہیں۔ گھومتی ہیں' جھومتی ہیں۔

مری کی سڑکوں پر انہیں دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا کہ وہ گھر سے آئی ہیں یا واپس گھر جارہی ہیں۔ آپ محسوس کرتے ہیں کہ وہ نیلے آسمان سے اتری ہیں اور ابھی ابھی گلابڑی کی جھاڑیوں کے جھنڈ میں غائب ہو جائیں گی اور پھر ان کے رنگدار پلو آسمان پر قوس کی شکل میں لہرا جائیں گے۔ مری میں اگر وہ کسی دوکان پر خرید وفروخت کے لیے رک جائیں تو آپ فوراً سمجھ جائیں گے کہ وہ صرف اس لئے رکی ہیں کہ آپ کو قریب آنے کا موقع دیا جائے۔ دوکان سے اگر وہ کڑاہی بھی خرید لیں تو بھی آپ کو یقین نہ آئے گا کہ وہ گھر میں پکوڑے تلنے کا کام کرتی ہیں بلکہ کڑاہی کو دیکھ کر آپ کو پکنک کا خیال آتا ہے گھر کا نہیں۔ اگر کسی خاتون کے دامن سے بچہ چمٹا ہوا ہو تو بھی ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ رنگین پھول اس کے دامن کا سنگھار ہے۔

پہاڑ پر ٹہلتی ہوئی لڑکیوں کی عظمت کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ پہاڑ خود اس حقیقت عظیم سے منکر نہیں ہو سکتے انہیں مسکراتے اور ٹہلتے دیکھ کر پہاڑ چپکے سے پیش منظر سے پس منظر میں جا کر باادب استادہ ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہوٹل میں بیرا باادب کھڑا ہو کر منتظر رہتا ہے۔

پہاڑوں کی اس عادت پر کئی ایک لوگ انہیں تماشبین سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کا رویہ مداریوں کا سا ہوتا ہے۔ نو واردوں کے سامنے وہ اپنا طلسماتی پٹارو کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور منظر نگاری کی بین پر طرح طرح کی دھنیں نکالتے ہیں اور جب نو وارد اس مدہوش کن طلسم کے زیر اثر مسحور ہو جاتے ہیں تو وہ چپکے سے پس منظر میں جا کھڑے ہوتے ہیں اور پھر تماش بینی کے شغل میں لگ جاتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں کہ جب کیفیت کا جام خالی ہو جائے تو پھر اسے بھر دیں۔

دفتری کلرکوں کا کہنا ہے کہ یہ محض الزام ہے۔ کسی تخیل پرست نے یہ رنگین داستان محض اپنے آپ کو فریب دینے کے لیے گھڑ لی ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

پہاڑ بیچارے کیا تماش بینی کریں گے پہاڑوں کو بانس پر چڑھانے کی تمام تر ذمہ داری شاعروں پر عائد ہوتی ہے۔انہوں نے قافیہ ردیف کے زور پر بات کا بتنگڑ بنا رکھا ہے۔دراصل پہاڑ تفریح کے بجائے مسلسل کوفت کے سامان بہم پہنچاتے ہیں۔پہاڑ بھی کوئی رہنے کے قابل جگہ ہیں۔دفتر کی طرف جاتے ہوئے سڑکیں ہونکنے لگتی ہیں۔ڈنڈیاں ٹیلوں کے کنارے ہونکتی ہوئی رینگنے لگتی ہیں۔راستے محض شرارت کرنے کی غرض سے شیطان کی آنت بن جاتے ہیں۔پتھر قدم قدم پر پاؤں سے الجھتے ہیں۔گھاس صرف اس لئے سبز اور ملائم ہو جاتی ہے کہ پھسلنے میں آسانیاں پیدا ہوں۔

اگر آپ عاشق مجبور ہیں تو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ پہاڑ کا قصد نہ کریں اگر کسی شخص نے آپ سے یہ کہہ دیا ہے کہ ان حالات میں کہ پہاڑ آپ کا غم غلط کریں گے تو یقیناً وہ شخص آپ کا دوست نہیں۔ممکن ہے وہ پنڈی مری بس سروس کا ایجنٹ ہو اور آپ جانتے ہیں ایجنٹوں سے بچ کر رہنا چاہیے۔

کوئی عاشق مجبور پہاڑ پر آ جائے تو بیچارے کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے نہ جانے پہاڑ کو کیسے خبر پہنچ جاتی ہے کہ عاشق مجبور آ رہے ہیں۔ان کے پہنچتے ہی پہاڑ کینچلی بدل کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ہوا درختوں سے لپٹ لپٹ کر رونا شروع کر دیتی ہے سر سبز پتے سسکیاں بھرنے لگتے ہیں۔

کوئلیں تو کہاں تو کہاں کو کنے لگتی ہیں۔بیلیں یوں ڈھلک جاتی ہیں جیسے بے آسرا ہونے پر فریاد کر رہی ہوں۔چشمے ٹپ ٹپ رونے لگتے ہیں۔آبشار پتھروں سے سر ٹکرانے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔چوٹیاں سر لٹکائے بیٹھ جاتی ہیں۔وادیاں لٹے پٹے انداز سے پڑ جاتی ہیں۔یہ عالم دیکھ کر آپ کے دل کا غم از سر نو تازہ ہو جاتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ سب کچھ تیاگ کر کسی برفیلی چوٹی پر جا بیٹھیں اور باقی عمر اللہ کی یاد میں بسر کر دیں۔

پہاڑ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ آپ کے دل میں آرزو ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ اس آرزو کے قیام کی صورت بھی پیدا کر دیتا ہے اور آرزو دہ قیام جبھی ممکن ہے جب تکمیل آرزو کا سوال پیدا ہی نہ ہو۔تو نہ تو آپ تیاگ کی آرزو کو ترک کر سکتے ہیں اور نہ اس کی تکمیل کے لیے عملی طور پر کچھ کرتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تیاگ کی آرزو کو لئے آپ آبشاروں کے ساتھ سر پٹکتے ہیں۔چشموں کے ساتھ ساتھ ٹپ ٹپ روتے ہیں۔ٹہنوں سے لپٹ لپٹ کر آہیں بھرتے ہیں اور راہ سے بھٹکی ہوئی ڈنڈیوں کے ساتھ ساتھ آوارہ پھرتے ہیں اور اس طرح زندگی کی جملہ لذتوں سے بڑی لذت سے سرشار رہتے ہیں۔تحقیق عاشق مجبور سے پہاڑوں کا رویہ شرمناک ہے لیکن پہاڑ سے اس کی بات کیجئے تو وہ رازدارانہ انداز سے مسکرا دیتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں ہم کس قابل ہیں۔شاید وہ سمجھتے ہیں کہ

KitaabPoint.blogspot.com

عاشق مجبور پر اس سے بڑھ کر کوئی احسان کیا ہی نہیں جا سکتا۔

پہاڑ انسان کو وقت' فاصلے اور سمت کے متعلقہ احساسات سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ آپ کو ادھر ڈاکخانے جانا ہے یہ جو سامنے ڈاک خانہ دکھائی دے رہا ہے۔ ادھر نیچے کی طرف' آپ بلا تامل اس راستے پر اتر جایئے جو ادھر جا رہا ہے۔ یقین کیجئے آپ ڈاک خانے پہنچ جائیں گے یہ نہ سوچئے کہ راستہ تو متضاد سمت کو جا رہا ہے اور صاف معلوم ہو رہا ہے کہ وہ ڈاکخانے کی جانب جانے کی جگہ سے دور بھاگ رہا ہے تو اس راستے پر جاتے ہوئے اگر آپ میں سمت اور فاصلے کا گزشتہ احساس کسی حد تک باقی ہے تو آپ کا ضمیر اس غلط روی پر آپ کو لعنت ملامت کرے گا۔ دل سے آواز اٹھے گی تحقیق اب بھی وقت ہے۔ آپ اپنی موجودہ روش سے توبہ کر لیں اور بھٹکنا چھوڑ کر صراط مستقیم کو اپنا لیں۔ میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ پہاڑ پر ضمیر کی آواز پر کان نہ دھریئے۔ اگر پہاڑ پر بھی آپ نے صراط مستقیم کا خبط چھوڑا تو پھر آپ کا خدا ہی حافظ ہے۔ ضمیر کی آواز اور صراط مستقیم کے متعلقہ احکامات صرف ان لوگوں کے لیے اتارے گئے ہیں جو میدانوں میں رہتے ہیں۔

خصوصاً چٹیلے میدان میں یہ چیزیں پہاڑ پر نہیں چلیں گی اور اگر آپ نے انہیں زبردستی چلانے کی کوشش کی تو صرف وہی چلیں گی آپ خود نہ چل سکیں گے۔

یہ سامنے ڈاکخانے تک پہنچنے کے لیے اگر آپ کو گھنٹوں گھومتی پھرتی ڈنڈی پر صحرا نوردی کرنی پڑے تو بھی ہمت نہ ہاریئے۔ کہیں جلد منزل کو پا لینے کے گمراہ کن شوق میں یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ آپ صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں ورنہ یقین جانیئے آپ کبھی بھی ڈاکخانے نہ پہنچ سکیں گے۔ رہا فاصلے اور سمت کا سوال تو گھبرایئے نہیں یہاں چند روز ٹھہرنے کے بعد آپ ان ظاہری امتیازات کے احساس سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ ڈاکخانہ سامنے دکھائی دے رہا ہے تو پڑا دکھائی دے ڈنڈی مخالف سمت جا رہی ہے' پڑی جائے' راستہ کٹنے میں نہیں آ رہا نہ سہی۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے آپ ڈاکخانے پہنچنے کے بجائے ڈاکخانے کا طواف کر رہے ہیں اور مختلف پہلوؤں سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ جیسے آپ سروے کے دفتر کے ملازم ہوں۔ کوئی حرج نہیں' آپ صبر و تحمل کو ہاتھ سے جانے نہ دیں اور راضی برضائے کے اصول کو پلے باندھے اسی راستے پر چلتے رہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ جب آپ ڈاکخانے پہنچنے سے قطعی مایوس ہو جائیں گے تو دفعتاً موڑ مڑنے کے بعد کیا دیکھیں گے کہ آپ ڈاکخانے کے سامنے کھڑے ہیں۔ وہی ڈاکخانہ جو آدھ گھنٹہ پہلے آپ پیچھے بہت دور چھوڑ آئے تھے پہاڑ کی خصوصیت ہے کہ وہ آپ کو صبر و تحمل سکھاتا ہے اور یہ سمجھاتا ہے کہ ظاہری حقائق اصلی حقائق سے مختلف چیز ہیں۔

میدانوں میں تو منزل اہم ہوتی ہے لیکن پہاڑوں پر آپ اس حقیقت کو پا لیتے ہیں کہ منزل کی نسبت منزل کو پا لینے کی جدوجہد

KitaabPoint.blogspot.com

زیادہ اہم ہے اور حصول منزل کی مسرت اسی جدوجہد کی وجہ سے ہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ گھنٹوں کسی ایک راستے پر گھومنے پھرنے کے بعد منزل پر پہنچے مگر عین اسی مقام پر واپس آ جاتے ہیں جہاں سے آپ روانہ ہوئے تھے۔ اہل ذوق تو اس بات پر گھبرانے کی بجائے محظوظ ہوتے ہیں۔ البتہ جذباتی لوگ سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ مگر پہاڑ جذباتی لوگوں کو بہلانا جانتا ہے۔ وہ ہر راستے اور ہر موڑ پر ایسے حسین مناظر پھیلا دیتا ہے کہ بسا اوقات چلتے چلتے وہ قطعی طور پر بھول جاتے ہیں کہ ان کی کوئی منزل بھی ہے اور مناظر سے محظوظ ہونے کے بعد وہ خوشی خوشی گھر لوٹ آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر وہ بار بار اسی مقام پر پہنچیں جہاں سے وہ چلے تھے تھے تو بھی انہیں احساس نہیں ہوتا کہ وہ بار بار ایک ہی مقام سے منظر کو دیکھ رہے ہیں بلکہ ہر بار وہ اسی منظر کو نئے شوق اور ولولے سے دیکھ کر چلاتے ہیں' واہ واہ' یہ منظر اس سے بھی اچھا ہے۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ہم نے ڈلہوزی سے چمبہ کو جانے کا ارادہ کیا۔ صبح سویرے احمد اور میں ہاتھوں میں بیگ لٹکائے شانوں پر کمبل ڈالے اس ٹیلے پر چڑھ گئے جہاں سے چمبے کی ڈنڈی نکلتی ہے۔ سڑک تقریباً ہموار تھی۔ چاروں طرف خوشنما مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ احمد ہر موڑ پر رک جاتا۔ آہا' بھئی وہ بھی دیکھنا' دیواروں کا جھنڈ اور نیچے آبشار کا گرتا ہوا دھارا' اتفاق سے چند ہی قدموں کے بعد ہمیں ایک لکڑی والا مل گیا۔

بڑے میاں چمبے کو کونسا راستہ جائے گا۔

سیدھے اسی سڑک پر چلے جایئے۔ پھر بائیں طرف کو ایک ڈنڈی پھوٹے گی۔ وہ آپ کو چمبے لے جائے گی۔

کتنی دور ہے۔

بارہ کوس۔

تحقیقات کے بعد ہم اطمینان سے آگے چل پڑے۔ آہا بھئی یہ دیکھنا احمد چلایا۔ بھئی ادھر بھی دیکھو ذرا....... میں نے شور مچایا۔ اسی طرح چلتے چلاتے دوپہر کے قریب ہم نے پھر ایک راہ گیر سے پوچھا۔ میاں چمبے کو یہی راستہ جاتا ہے نا؟

جی' وہ بولا۔ سیدھے اسی سڑک پر چلتے جایئے' بائیں طرف ایک ڈنڈی نکلے گی۔

واہ' واہ' احمد چلایا۔ اس منظر کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔

اور ادھر بھی تو دیکھوں میں نے اسے کہا اور ہم چلتے رہے۔

ہائیں' احمد بولا۔ یہ منظر تو وہی ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

جو تم نے کل خواب میں دیکھا تھا۔ میں نے طنزاً کہا۔ وہی نا۔

مطلب ہے کچھ مانوس سا لگتا ہے۔

تم پہاڑوں کو نہیں جانتے۔ پہاڑ کے ہر منظر کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک مانوس ایک انوکھا' میں نے اسے پہاڑی منظر پر لیکچر پلانا شروع کر دیا۔

دو ایک گھنٹے سفر کرنے کے بعد وہ چلایا' ارے یار تم بالکل ٹھیک کہتے تھے اب یہ سامنے گاؤں' دیکھو' دو گھنٹے ہوئے بالکل ایسے ہی گاؤں سے ہم گزر کر آئے ہیں۔

ہاں دیکھنا۔ میں نے اپنی بات کے ثبوت پر خوش ہو کر کہا۔

شام کے چھ بجے ہمیں ایک شہر دکھائی دیا۔ احمد چلایا۔ وہ دیکھو درختوں کی اوٹ میں شہر معلوم ہوتا ہے۔ بڑا خوبصورت شہر ہے۔ یہ چمبہ۔ سبحان اللہ' شہر کو دیکھ کر ہم اس طرف نکلتی ہوئی ڈنڈی پر اتر گئے۔

میں کہتا ہوں احمد بولا۔ یہ پہاڑی شہر بالکل ایک سے ہوتے ہیں۔

ہاں' میں نے کہا۔ دیکھو نا یہ چمبہ بھی ڈلہوزی ہی معلوم ہوتا ہے۔

ہائیں....... احمد دروازے کو دیکھ کر رک گیا۔ ارے یہ تو اپنا گھر ہے۔

گھر؟

اور ہم دونوں چپ چاپ گھر میں داخل ہو گئے۔ ہمیں گھر پہنچنے کی اس قدر خوشی ہوئی ہے کہ چمبہ تو بالکل ہی ذہن سے اتر گیا۔

چائے پیتے ہوئے احمد بولا' یار میں سوچتا ہوں اگر ہم گھر بھی نہ پہنچتے تو.......

یہی تو پہاڑوں کی خوبی ہے اور میں اسے پہاڑوں کی یہ خصوصی خوبی وضاحت سے سمجھانے لگا۔

لیکن ٹھہریئے۔ برسبیل تذکرہ پہاڑ کی سب سے بڑی خصوصیت کی بات بھی ہو جائے تو مناسب رہے گا۔

میرا دعویٰ ہے کہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو شہزادہ گوتم کبھی مہاتما بدھ نہ بنتے اور دنیا پر اس حقیقت کا انکشاف نہ ہوتا کہ دیکھنا چاہتے ہو تو آنکھیں موند لو اور آپ کو کبھی معلوم نہ ہوتا کہ سامنے دکھائی دینے والا ڈاکخانہ اصلی ڈاکخانہ نہیں یعنی وہ ڈاک خانہ نہیں جہاں آپ جانا چاہتے ہیں۔ مخالف سمت کو جاتا ہوا راستہ درحقیقت مخالف سمت کو نہیں جاتا اور تحقیق یہ گھومتی ہوئی ڈنڈی ہی صراط مستقیم ہے۔ اگر آپ صدق دل سے یہ حقیقت تسلیم کر لیں کہ پہاڑ نہ ہوتے تو گم تم ساری عمر گوتم ہی رہتے تو آپ پر بہت سے ضمنی حقائق بھی آشکار ہو جائیں

KitaabPoint.blogspot.com

گے۔ مثلاً آپ پر واضح ہو جائے گا کہ گیا کا بن جہاں گوتم کو نروان حاصل ہوا تھا اور وہ مہاتما بدھ بنے گئے تھے۔ دو ہزار قبل مسیح میں ایک پہاڑی مقام تھا۔ یعنی آپ اس حقیقت کو پالیں گے کہ آہستہ آہستہ پہاڑ میدانوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ یعنی ارتقا کا عمل مکمل طور پر آپ کی سمجھ میں آ جائے گا اور آپ کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ جغرافیائی حالات کو روحانی کیفیات میں بڑا دخل ہے۔

جغرافیائی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو پہاڑ صرف اس لئے بنائے گئے ہیں کہ صبح صادق کا عالم لافانی کر دیا جائے تا کہ انسان کو موقعہ ملے کہ وہ صبح صادق کے نور میں اپنی روح کی کثافتوں کو دھو سکے۔ آپ کہیں گے کہ انسان کی روح کو وقت سے کیا تعلق اگر آپ یہ بھی جانتے تو ظاہر ہے کہ آپ کو شعر و شاعری سے چنداں دلچسپی نہیں اور اگر آپ کو شعری و شاعری سے دلچسپی نہیں تو پہاڑوں سے متعلق جملہ باتیں سمجھنے کا قضیہ ہی چھوڑ یئے۔

مثلاً جو شعر کہا ہے کسی نے:

ہم ایسے اہل نظر کو قبول حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

دیکھا آپ نے وقت کی عظمت کی یہ کیفیت ہے۔

مثلاً شام کے وقت کو ہی لیجئے۔

چاہے آپ کو سوگوار محبت نہیں' چاہے آپ کو خسارہ نہیں رہا۔ چاہے آپ غم روزگار سے قطعی طور پر ناواقف ہیں۔ شام کے وقت جب ڈوبتے سورج کی کرنیں بادلوں میں آگ سی لگا دیتی ہیں اور مشرق سے شام کا دھندلکا نکل کر چھا جاتا ہے اور ہوا دور وادیوں میں سسکیاں بھرتی ہے تو خواہ مخواہ آپ کا جی چاہتا ہے کہ آہیں بھریں' شعر گنگنائیں اور دنیا کو فانی سمجھیں۔

پھر جوں جوں رات پڑتی جاتی ہے دل میں اک اضطراب پیدا ہوتا جاتا ہے۔ خواہشات کی بھیڑ لگنے لگتی ہے۔ گرد و پیش میں زندگی کی لہر دوڑنے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ آپ بار بار عیش کوش گنگنانا شروع کر دیتے ہیں اور زندگی ایک رنگین روپ دھار لیتی ہے۔ احساسات میں جوش اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ کا دل اور جسم مل کر سازش کرتے ہیں۔ اخلاق سماج اور مذہب کے خلاف سازش۔ اس وقت آپ یہ شعر گنگنانا پسند کرتے ہیں۔

اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

KitaabPoint.blogspot.com

یہ وقت عیش وطرب کی محفل سجانے اور گناہ کی لذتوں میں گھر جانے کے لیے کس قدر موزوں ہوتا ہے۔ پھر دو بجے جرم وسازش کا دور چلتا ہے راگ رنگلی آوازیں مدھم پڑ جاتی ہیں اور محبت بھری سرگوشیاں ختم ہو جاتی ہیں اور صرف محفل شب کی جلی ہوئی شمع سلگتی رہ جاتی ہے۔ عشق ومحبت کی ملاقاتیں اپنی دلچسپی کھونے لگتی ہیں۔ تین بجے کے قریب توبہ اور عفو کی دعائیں شروع ہوتی ہیں گزشتہ گناہوں پر آنسو بہائے جاتے ہیں۔ صفائی قلب کے لیے مناجاتیں پڑھی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ صبح صادق کے وقت حمد وثنا کی کیفیت تمام عالم کو سرشار کر دیتی ہے۔ عیش وطرب جرم اور سازش کے متوالے اس وقت خواب خرگوش میں پڑے ہوتے ہیں۔ صبح صادق کے رو پہلے دھند لکے میں آپ گناہ نہیں کر سکتے۔ رنگ رلیاں نہیں منا سکتے۔ عیش وطرب جرم اور سازش کے متوالے اس وقت خواب خرگوش میں پڑے ہوتے ہیں۔ صبح صادق کے رو پہلے دھند لکے میں آپ گناہ نہیں کر سکتے رنگ رلیاں نہیں منا سکتے۔ عیش وطرب کی محفل آراستہ نہیں کر سکتے۔ سازش کرنا یا قتل کرنا اس وقت ممکن نہیں صبح صادق کے رو پہلے دھند لکے میں حمد وثنا کے سوا کچھ ممکن نہیں۔

وقت اور روح کے تعلق کو سب سے پہلے راگ ودھیا والوں نے سمجھا۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی توجہ وقت کی عظمت کی طرف مبذول ہوگئی اور انہوں نے راگ کی عظمت کا خیال نہ کیا۔ اس لئے انہوں نے وقت کے راگ کی بات چھیڑ دی اس طرح راگ کے وقت کی حقیقت پس پشت پڑ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے وقت کے مطابق راگ وضع کئے اور انہیں خصوصی اوقات سے وابستہ کر دیا۔ کلیان کی قسم کے اضطراب بھرے راگ رات کے پہلے پہر سے متعلق کر دیئے گئے۔ آدھی رات کو عفو اور توبہ کے وقت جوگ اور بہاگ سے دکھی راگوں سے مزین کیا گیا اور صبح صادق کو حمد وثناء کے لیے وقف کر دیا گیا۔ اس طرح راگ کی حیثیت وقت کے دربار میں چوبدار کی سی رہ گئی۔ حالانکہ حقیقت میں وقت کے عالم کو پیدا کرنا اور اسے قیام بخشنا اس کی قدرت میں تھا۔

جملہ اوقات میں صبح صادق کی اہمیت سب سے زیادہ ہے اور پہاڑوں کا مقصد صبح صادق کو لافانی کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہاڑوں کی حیثیت راگ کی حیثیت سے کم نہیں۔

دس ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر جا کر دیکھئے۔ جہاں ہر وقت صبح صادق کا عالم چھایا رہتا ہے۔ چوٹیاں ادب سے حضوری میں استادہ ہیں۔ وادیاں عظمت الٰہیہ سے دم بخود پڑی ہیں۔ برف نورانی چادر اوڑھے خالق کون ومکاں کی عظمت کا ورد کر رہی ہے۔ فضا دودھیا سپیدی میں نہا کر نکلی ہے۔ ہوا میں اک پاکیزگی ہے اک لطافت ہے۔ طوفان اللہ تعالےٰ کے نام کا ورد کر رہا ہے۔ درخت بنفس نفیس وحدانیت کا اشارہ بنے کھڑے ہیں پودوں نے انگشت شہادت اٹھا رکھی ہے ہوا حمد وثناء کر رہی ہے۔ طوفان وجدانی کیفیت میں سرشار ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

یہاں حمد وثنا کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں پتھر بھی سربسجود پڑے ہیں۔ برفانی تودے سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ یہاں کوئی گناہ سرزد نہیں ہوسکتا کوئی سازش نہیں ہوسکتی۔ یہاں جرم کا خیال بھی دل میں نہیں آ سکتا۔ کوئی محفل طرب نہیں سجائی جا سکتی۔ یہاں صرف بھگتی کی جا سکتی ہے۔ یوگی یہاں دیوتاؤں کی بھگتی کے لیے آتے ہیں اور ان جانے میں وحدانیت کی مالا جپنے لگتے ہیں۔ وہ کرشن مہاراج سے دھیان لگانے کے لیے آتے ہیں اور اس دیوتا کی حمد وثنا میں لگ جاتے ہیں جس کا نہ جسم ہے اور نہ شکل۔ وہ خالق ارض و سما جس کا سب سے بڑا وصف عظمت ہے۔

کہتے ہیں اگر سمندر نہ ہوتا تو انسان لاشئی وجود کے احساس سے بیگانہ رہتا۔ لیکن اگر پہاڑ نہ ہوتے تو انسان کے دل میں اللہ تعالے کی عظمت کا احساس پیدا ہی نہ ہوتا۔ وہ مسلسل صبح صادق نہ ہوتی جو اس کے نورانی وجود کا پرتو لئے ہوئے ہے۔ اس کے باوجود اگر لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ پہاڑ صرف اس لئے بنے ہیں کہ چوٹیوں کی بلندیوں کی پیمائش کی جائے اور پھر ان پر جھنڈا گاڑ دیا جائے تو میں کیا کہوں۔ چوٹیوں پر رہنے والوں کو دیکھیے ان کے دل میں صبح صادق کے پرتو کی جھلک ہے وہ اللہ تعالیٰ کی سرزمین پر ہل چلا کر گاڑھے پسینے کی کمائی سے پیٹ پالتے ہیں اور اللہ کا شکر بجالاتے ہیں۔ عورتیں پتھروں کے گھروندوں میں پٹو بننے میں مصروف رہتی ہیں۔ ان کی آنکھیں صبر و تحمل اور قناعت کی روشنی سے منور ہوتی ہیں۔ ہونٹوں پر راضی بہ رضائے ثبت ہے' چہرے حمد وثنا کے سکون و اطمینان سے روشن ہیں۔

لیکن پہاڑوں کے دامن پر وادیوں میں اک آگ لگی ہے ایک اضطراب لوگوں کے بند بند میں کروٹیں لیتا ہے۔ عورتوں کی آنکھوں سے شرارے اٹھتے ہیں۔ ہونٹ رضامندی کے تبسم سے سرشار رہتے ہیں۔

پہاڑوں میں گھومتے پھرتے میں نے مختلف اثرات سے بھرے مقام دیکھے ہیں۔ ایسے مقام جو انسان کے دل پر خصوصی اثر رکھتے ہیں اور خصوصی جذبات کے متحرک ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈلہوزی سے چمبے جاتے ہوئے سڑک پر ایک مقام ہے 'کھجا' یہاں فضا ہر وقت رومانی جذبات بکھیرتی رہتی ہے۔ ہر رنگین آنچل کو ہلتے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے گویا وہ چلتے چلتے بلا گئی ہو۔ ہر نیم وا دروازے کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ وہ اندر بیٹھی انتظار کی جھلک دکھائی دے گی اور پھر ایک سیاہ موٹی آنکھ درز سے طلوع ہوگی اور اس غماز آنکھ سے دعوت چھلکے گی۔ کھجار میں جا کر جی چاہتا ہے کہ ہر راہ گیر سے اظہار محبت کریں۔ نیلے پانی کی جھیل کے کنارے مخملی گھاس پر لیٹ کر وصال کے گیت گائیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی ایک حسین دوشیزہ ہے جو آپ سے ملنے کے لیے آ رہی ہے۔

ایسے مقامات بھی ملتے ہیں جہاں آپ محسوس کریں گے کہ زندگی ایک سوگوار حسینہ ہے جو آپ سے منہ موڑ کر بیٹھی ہے۔ فضا آہوں

KitaabPoint.blogspot.com

اور چکیوں سے بھری ہوئی ہے۔

ایسے مقامات جہاں خدائے قہار و جبار کا وجود مسلط ہے۔ جہاں قدرت کی جابرانہ طاقتوں کا دور دورہ ہے جہاں قدرت کی جابرانہ طاقتوں کے مقابل انسان اپنے آپ کو ہیچ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور عفو و خطا کے جذبات سے لاچار ہو کر انسان سجدے میں گر پڑتا ہے اور ایسے مقامات جہاں اللہ تعالے کی عظمت سے متاثر ہو کر انسان محبت' خلوص اور نیاز کے بے پناہ جذبے سے سربسجود ہو جاتا ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

غصہ

کسی کو غصہ میں دیکھ کر نہ جانے میں ایسے کیوں محسوس کرتا ہوں جیسے کوئی موٹر لاری پہلے گیئر میں پہاڑی پر چڑھ رہی ہو۔شاید اس لئے کہ بچپنے میں مجھے پہاڑ پر جانے کا اتفاق ہوا تھا جہاں بڑبڑاتی ہوئی لاریوں کو دیکھ کر بیحد محظوظ ہوا اور پھر جب گھر لوٹا اور ایک دن چچی کو غصے میں دیکھا تو میں چیخ اٹھا ''آپا چپ' لاری پہاڑ پر چڑھ رہی ہے۔'' غصے کے بارے میں میں اپنی وہ پرانی رائے بدل نہیں سکا۔البتہ ان دنوں جب لاری پہاڑی پر چڑھتی تو شور مچاتی' منہ سے جھاگ اڑاتی چیختی چلاتی نظر آتی تھی۔لیکن اب وہ زور لگاتی ہے ڈرتی ہے کہ کہیں پیچھے نہ لڑھک جائے' لرزتی ہے! ہوںکتی ہے!

غصے کی کیفیت ایک مثال سے واضح ہوسکتی ہے آپ تیز رفتاری سے کہیں بڑھتے جا رہے ہیں آپ کے جی میں سمائی ہے کہ بڑھتے ہی جائیں۔معاً آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کا پاؤں کنارے پر ہے اور سامنے ایک گہری کھائی منہ کھولے پڑی ہے۔آپ جھجک کر رکتے ہیں۔پلٹتے ہیں تاکہ بھاگ کر آئیں اور کھائی کو پھاند جائیں سو خطرہ محسوس کر کے جھجکنا' ہٹنا اور بھاگنا اس مرکب کیفیت کا نام غصہ ہے۔ اگرچہ عام طور پر ہم صرف اس جست کو غصہ سمجھتے ہیں جو ہمیں کھائی کے اس پار پہنچا دیتی ہے ظاہر ہے کہ غصے میں تین کیفیتوں کا ہونا لازم ہے خطرہ محسوس کر کے جھجکنا' تیاری' یعنی جست لگانے کے لیے' تیسرا گیئر بدلنا تاکہ انجن زیادہ سے زیادہ طاقت خرچ کر کے خطرے کے مقام کو پار کر سکے۔

مگر غصے میں خطرے کا احساس چاہے وہ واضح ہو یا موہوم حقیقی ہو یا خیالی لازم ہے اور جست کا عمل' خطرے سے مقابلہ کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ڈر کی طرح فرار کی ترغیب نہیں دیتا۔عمل تو دونوں سے وابستہ ہے۔لیکن زاویہ ہائے عمل مختلف ہیں۔

شیر کو دیکھ کر مجھے غصہ نہ آئے گا۔بشرطیکہ وہ چڑیا گھر کے مضبوط پنجرے میں بند ہو۔البتہ مجھے اس بدتمیز چوہے پر بے حد طیش آتا ہے جو رات میرے بستر پر پھدک پھدک کر مجھے جگا دیتا ہے اور میں قسم کھا کر اٹھ بیٹھتا ہوں اور سوٹا لئے اس کے پیچھے دوڑتا پھرتا ہوں۔لیکن اسے پکڑ نہیں سکتا۔یہی بات میرے غصے کو خالص بنا دیتی ہے۔جب تک وہ میرے ہاتھ نہیں آتا جب تک اس کا وجود مجھے عاجز کر سکتا ہے خطرہ کا احساس دیتا ہے اور یہ احساس نہ ہو تو غصہ یوں بے معنی ہو جاتا ہے جیسے لٹ جانے کا اندیشہ نہ ہونے پر بھی دروازے کو مقفل کر دیا جائے۔

KitaabPoint.blogspot.com

شیر پر غصہ کرنا کس قدر بے معنی ہے وہ تو ہوا درندہ وہ کیا اس بات کو سمجھ لے گا کہ آپ صرف خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔ وہ تو یہی سمجھے گا کہ آپ غصے میں ہیں اور پھر وہ اس غلط فہمی میں نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ البتہ چوہے کی اور بات ہے وہ عرصہ دراز سے میرے گھر میں رہتا ہے اور میری عادتوں سے واقف ہے اس لئے وہ مجھے غصے میں دیکھ کر صرف بھاگ کر گم ہو جاتا ہے۔

قدرت نے غصے اور ڈر کا امتیاز بھی تجویز کیا ہے۔ چھوٹے موٹے خطرے غصہ پیدا کرتے ہیں اور بڑے بڑے خطرے ڈر۔ پہلی صورت میں ہم خطرے سے دوچار ہونے کے لیے آگے بڑھتے ہیں اور دوسری صورت میں فرار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر فرار کی کوئی راہ نہ ہو تو معاً ہمیں غصہ آ جاتا ہے چاہے خطرہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔

خیال فرمایئے اگر کوئٹہ کے بھونچال پر کسی کو غصہ آ جائے تو کیسی مضحکہ خیز صورت پیدا ہو۔ ادھر بھونچال ادھر غصہ کتنی بے معنی بات ہے آپ کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ مجھ سا پڑھا لکھا انسان ایسے وقت چارپائی پر یوں پڑا رہے گا جیسے کل کا مرا ہوا ہو۔ بھونچال میں فراری حرکت ایسی ہی بے معنی ہوگی جیسے مقابلہ کرنے کی کوشش۔ چونکہ وقت یہ ہے کہ بھونچال صرف ہمارے گھر نہیں آتا باہر گلی میں بھی آتا ہے اور پرے جنگل میں بھی۔ اس کے علاوہ بزرگوں کا قول ہے کہ بھونچال میں چلنے پھرنے سے فالج ہو جاتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ عمارت تلے دب جانے کے خطرے سے بچنا چاہیے۔ لیکن ایسے موقع پر زمین کا پھٹ جانا بھی تو ممکن ہے اور میں زمین میں دفن ہونے پر عمارت میں دفن ہونے کو ترجیح دیتا ہوں۔ کیونکہ عمارتوں تلے انسانوں کے علاوہ قیمتی چیزیں بھی دب جاتی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ریلیف پارٹی کے کھودنے پر چیزوں کی بجائے انسان نکل آئے۔

غصے کا ذکر چھڑ جائے تو مجھے آسکروائلڈ یاد آ جاتا ہے۔ جس نے بنی نوع انسان پر اس بڑی حقیقت کا انکشاف کیا کہ ادھار نوجوان کا سرمایہ ہے۔ سچ پوچھئے تو اس اچھوتی سی بات میں دنیا بھر کی حقیقتیں پنہاں ہیں۔ اس کے علاوہ اس انکشاف کے بعد ایک تو قرض مانگنا آسان ہو گیا یعنی تجارت چل نکلی دوسرے قرض مل جانے پر حصول زر کی مسرت الگ اور جوانی کا احساس الگ اور اگر دینے والا دینے کی جگہ صرف طنزاً مسکرا دے تو....... تو وہ جاہل مطلق ہے۔ جس نے آسکروائلڈ سے عالم کا بھی مطالعہ نہیں کیا اور پھر قرضہ ادا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بھلا اپنا سرمایہ بھی کوئی واپس کرتا ہے۔

آپ کہیں گے کہ اس انکشاف کو غصے سے کیا تعلق۔ ذرا غور فرمایئے۔ غصہ فی نفسہ ادھار ہے اور اس کے علاوہ نوجوان کا سرمایہ بھی۔ فرض کیجئے عام طور سے مجھ میں ایک گھوڑے کی طاقت ہے لیکن کسی وقت کسی زبردست دشمن سے واسطہ پڑ جاتا ہے تو مجھے غصہ ضرور آ جائے گا اور حسب ضرورت مجھے دو یا تین ہارس پاور کا مالک بنا دے گا تاکہ خطرے کا مقابلہ کر سکوں یہ زائد طاقت خالص

KitaabPoint.blogspot.com

''ادھار طاقت'' ہے۔

قدرت نے افراد میں طاقت بنک نہیں کھول رکھے جہاں طاقت جمع رہے اور ضرورت کے وقت استعمال ہو سکے۔ قدرت جمع کردہ اشیا کی بری عادت سے خوب واقف ہے وہ جانتی ہے کہ ہر ایسی چیز چاہے وہ دولت ہو طاقت ہو یا ب یو یاں اور چاہے وہ صرف اسی لئے جمع کی گئی ہو کہ ضرورت کے وقت کام آئے۔ ضرورت کے وقت کام آنے کی بجائے جمع کرنے والے کو بھی نکما کر دے گی۔ میرا مطلب ہے نہ صرف خرچ ہونے کے خلاف احتجاج کرے گی بلکہ آپ خود سچے دل سے پکار اٹھیں گے ''لیکن ابھی ضرورت ہی کب ہے؟'' مثلاً آپ پیسے اکٹھے کرنا یا ان کی حفاظت کرنا شروع کر دیجئے تو چند ہی دنوں میں وہ آپ کو اپنی حفاظت میں لے لیں گے۔ حتیٰ کہ آپ سرمایہ بن جائیں گے اور وہ خزانچی۔ پھر سرمایہ بھی کبھی خواہش یا ضرورت محسوس کر سکتا ہے؟ جبھی تو سرمایہ داروں کے خلاف جو احتجاج ہو رہا ہے مجھے اس سے قطعی ہمدردی نہیں۔

ہاں تو قدرت اس بات کو جانتی ہے کہ اگر انسان میں طاقت کا بنک کھول دیا جائے تو ہر کسی کو طاقت اکٹھا کرنے کا خبط ہو جائے گا۔ مرد سارا سارا دن چارپائی پر پڑے رہیں گے تاکہ اٹھنے بیٹھنے سے طاقت کا فضول اسراف نہ ہو۔ عورتیں بیٹھی انہیں مٹھی چاپی کرنے میں لگی رہیں گی۔ گھروں میں عورتوں کی تقسیم مساوی نہ رہے گی۔ جنگ کے زمانے میں ڈیفنس سیونگ پاور کے چندے عائد ہوں گے۔ پاور پوسٹل سرٹیفکیٹ خریدنے ہوں گے اور انجمنیں بنیں گی۔ جن میں شاید مجھے ایک بڑا عہدہ پیش کیا جائے یعنی اک قیامت بپا ہو جائے۔ چونکہ بازاروں میں چلتے پھرتے ہندوستانی شفاخانے دیکھنے میں آئیں گے اور مجھ ایسے شریف آدمی کے لیے سودا خرید کرانا بھی ناممکن ہو جائے گا۔ اس لئے ان حالات میں غصہ تو قطعی طور پر بے معنی ہو کر رہ جائے گا!

ہاں تو یہ زائد ہارس پاور جو غصے کی صورت میں آتی ہے بالکل میری تنخواہ کے مشابہ ہے میں 1948ء میں 1951ء کی تنخواہ اڑا رہا ہوں لطف یہ ہے کہ طاقت کا یہ ادھار آپ ہی آپ مل جاتا ہے۔ مانگنے کی ضرورت نہیں ہے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا قدرت دور اندیش ہے جبھی تو ادھار کھانے کو جمع کرنے پر ترجیح دیتی ہے۔ کیا یہ واضح ثبوت نہیں کہ قدرت ہر بھلے مانس کو غصہ ایک کارآمد چیز کے طور پر دیتی ہے جیسے پستول یا لٹھ۔ یعنی غصہ خطرے کے وقت حفظ ماتقدم کے کام آتا ہے۔

نوجوانوں کو تو بات بات پر خطرے کا احساس ہوتا ہے مگر بڈھوں کی بساط کم ہو جاتی ہے اور اکثر بساط سے بڑھ کر کام کرنا پڑ جاتا ہے۔ کام تو اتنے بڑے نہیں ہوتے لیکن بساط ہی کم ہو تو کیا کیا جائے۔ نوجوانوں کو غصے میں دیکھ کر کہا جاتا ہے غصہ ''حرام'' ہے۔ ادھیڑ عمر کو شاید غصے میں آنے کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ بہرحال وہ اکثر بیوی کے روبرو غصے میں آ جاتے ہیں۔ شام پڑی اور ان کا

KitaabPoint.blogspot.com

غصہ چکا اگرچہ صبح کے وقت ان کے انداز میں غصے کا شائبہ بھی نہیں رہتا۔

میری بیوی کو گلہ تھا کہ مجھے غصہ نہیں آتا اور شاید اسی وجہ سے وہ مجھے بدھو سمجھا کرتی تھی اور بالآخر مجھ سے علیحدہ ہوگئی۔ ایک روز اکیلے میں شاید نوکر کا ذکر کر رہے تھے بولی۔ آپ کیا کریں گے بھلا آپ کو تو غصہ بھی نہیں آتا۔ آپ!! اور وہ ہنسی بس پھر کیا تھا غصے سے لال ہوگیا میں پھر اس کی مسکراہٹ دیکھ کر خوش ہورہی ہے اپنے حسن تدبر پر ناراں! معاً مجھے خیال آیا کہ میرے غصے سے کام لیا جارہا ہے۔ اصولی طور پر تو مجھے اس بات پر اور بھی غصہ آنا چاہیے تھا۔ کام آنے میں تو بیشک مجھے خوشی ہوتی ہے مگر کام میں لائے جانے سے قطعی دلچسپی نہیں تو صاحب میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور وہ کھسیانی ہوگئی۔ وہ ہماری آخری ملاقات تھی...... لیکن اب میں سمجھدار ہوگیا ہوں اور میں نے قطعی ارادہ کرلیا ہے کہ پھر کسی بیوی سے سابقہ پڑا تو ہمیشہ ایک غصیلے خاوند کی حیثیت سے رہوں گا تاکہ مجھے بدھو نہ سمجھا جائے اور تیسری تلاش میں سرگرداں نہ ہونا پڑے۔

تو غصہ ایک طاقت ہے اور ہر طاقت کو چاہے وہ نقد ہو یا ادھار کام میں لایا جاسکتا ہے۔ مثلاً پہاڑوں میں بہتے ہوئے پانی کی روانی، پھیلی ہوئی دھوپ اور عورت کے چہرے پر حیا کی جھلکی، لیکن صرف آپ کے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ مجھے غصہ نہیں آتا۔ شاید آپ سمجھ رہے ہوں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ یقین جانئے میں جھوٹ نہیں بولتا۔ شاید آپ سچے ہوں اور آپ نے کبھی مجھے غصے میں دیکھا ہو۔ میں مان لیتا ہوں لیکن اس طرح تو آپ انارکلی میں ہر لحظہ خوبصورت چہرے دیکھتے ہیں اور مسجدوں میں مقدس صورتیں بھی...... مانا کہ میں اکثر غصے میں آجاتا ہوں لیکن مجھے غصہ کبھی نہیں آیا اور کبھی کبھار آ بھی جائے تو حالت اس قدر ناسازگار ہوتی ہے کہ بیکار ثابت ہوتا ہے۔

مثلاً میں بیٹھا سوچ رہا ہوں اگرچہ سامنے کتاب کھلی ہے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ سامنے کتاب کھلی ہو تو سوچنے کا عمل خوب رواں رہتا ہے اور دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ پڑھنے میں مشغول ہے اور اس لئے مخل نہیں ہوتے۔ حفیظ بھی کیا خوب آدمی ہے پچھلی مرتبہ جب مجھ سے ملاقات ہوئی تو کتنی دلچسپ باتیں سنائیں۔ فن گفتگو کا تو وہ استاد ہے اور وہ شعر کیا پرلطف شعر تھا اور میں لہر میں آکر شعر گنگنانے لگتا ہوں۔ اتفاق کی بات ہے کہ میرا گلا بھی خاصا منفرد ہے یعنی کتاب سامنے ہو اور گنگناؤں تو غالباً آپ یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ انگریزی پڑھ رہا ہوں ہاں تو میں وہ شعر گنگنانے لگتا ہوں۔ ان تینوں سے بچ کر رہیو کالے چھوٹے موٹے سے ...... ہائیں معاً میں رک جاتا ہوں۔ یہ شعر سنانے سے حفیظ کا مطلب کیا تھا بات تو اسمبلی کی عمارت کے بارے میں ہورہی تھی۔ اچھا تو اس نے شعر کے پردے میں مجھ پر فقرہ کسا تھا مجھے کالا اور چھوٹا سمجھتا ہے۔ بڑا گورا تو دیکھو...... شاید وہ سمجھتا ہے کہ میں کچھ سمجھ

KitaabPoint.blogspot.com

ہی نہیں سکتا....... بے وقوف' معاً میں غصے سے لال ہو جاتا ہوں....... پھر خیال آتا ہے کہ حفیظ کو تو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں یہ تو میں ہی ہوں جس نے اس کے ساتھ مل کر آپ بیتیاں لکھنے کا فیصلہ کیا....... اور دیکھئے اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ سب بڑے آدمی قد کے چھوٹے ہوتے ہیں ایک تو نپولین تھا اور....... اور ایک اپنے چودھری ہیں۔ مکتبہ اردو والے! اور پھر اگر موٹے لوگ نہ ہوتے تو شیکسپیئر کے ناول ردی کے بھاؤ بکتے!.......

دراصل....... یہ غصے کا عمل اس قدر پرائیویٹ رہتا ہے کہ اکثر کتاب اور میرے درمیان شروع ہوتا ہے اور کتاب اور میرے درمیان ختم ہو جاتا ہے۔ اس قدر مہلت بھی نہیں دیتا کہ کتاب کو ہٹا کر سامنے ٹنگی ہوتی سابقہ بیوی کی تصویر کو ہی گھور کر اسے اپنے ''غیر بدھو'' ہونے کا ثبوت دے سکوں۔ پھر خیال آتا ہے کہ چلو صاحب جب اصل کو یقین نہ دلا سکے تو اب تصویر کو گھورنا کس کام کا اور اگر گھور بھی لوں تو کیا وہ چوکھٹے سے اتر کر شام کی روٹی پکا دے گی میرے لیے؟

یہ تو خصوصی غصہ تھا نا جو آپ ہی آتا ہے۔ میرے عام غصے کی تفصیلات اس عقلمند بہرے کے خیالات سے ملتی جلتی ہیں جو اپنے دوست کی عیادت کو جا رہا تھا۔ مثلاً میں کسی صاحب سے کسی خاص کام کے لیے ملنے جا رہا ہوں اگر مجھے تانگے کے پیسے میسر ہوں تو حالات کا رخ ہی بدل جاتا ہے تانگے میں بیٹھ کر پیدل چلنے والوں کو دیکھنے میں وقت خوب کٹتا ہے اور پھر ادھر آپ روانہ ہوئے اور ادھر ان صاحب کا مکان آ گیا لیکن پیدل چلنے سے رستہ نہیں کٹتا تو سوچنا شروع کر دیتا ہوں بھئی میں جا تو رہا ہوں مگر خدا کرے اعظم مل جائے۔ اچھا تو اسے کہہ دونگا کہ بھئی یہ کام ہے اور یقیناً وہ یہ جواب دیگا لیکن میں یوں دہراؤنگا اس بات کو اور وہ مجبوراً یہ جواب دیگا....... لیکن اگر اس نے یہ کہہ دیا تو....... تو میں یہ جواب دونگا۔

اور اگر اس نے یہ کہا تو اس میں سراسر میری توہین ہوگی اور میں یہ بات کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔ اونہوں! یہ نہیں ہو سکتا۔ تو میں اسے کھری کھری سنا دوں گا۔ مجھے سمجھا کیا ہے اس نے؟ کیا سمجھا ہے اس نے مجھے؟ اور میں جھجک کر رک جاتا ہوں یعنی سامنے گہری کھائی آ گئی۔ اس حالت میں راہ گیر مجھے حیرت سے دیکھتے ہیں پڑے دیکھیں اعظم کی اتنی جرات! میں پہلے ہی جانتا تھا کہ وہ اچھا آدمی نہیں۔ اس سے ملنا بھی میری توہین ہے پھر جب ہوش آتا ہے تو دیکھتا ہوں کہ واپس گھر کو جا رہا ہوں۔ مجھے خیال آتا ہے کہ گھر میں جہاں ایک ہارس پاور کی بھی ضرورت نہیں خواہ مخواہ ہارس پاور سے اپنے آپ کو گرماتا ہاں اگر وہ سڑک پر مل جاتا تو میں مزاج پوچھنا تو درکنار اسے پہچاننے سے بھی انکار کر دیتا۔ لیکن اب گھر میں بیٹھ کر چارلی چپلن کی فورڈ کار کی طرح آپ ہی آپ تھرکنا....... بس انہی نکات کی زد میں آ کر میرے کان از سر نو زرد پڑ جاتے ہیں اور....... اور میری بیوی مجھے بدھو سمجھ کر مجھ سے علیحدہ ہو جاتی ہے اور

KitaabPoint.blogspot.com

.... لیکن ٹھہریئے شاید آپ بھی مجھے بدھو سمجھ رہے ہوں۔ شاید آپ سمجھتے ہیں کہ میں سمجھتا نہیں۔ اچھا تو میں سب کچھ کھول کر کہہ دوں گا۔ ہاں' سن لیجئے کہ آپ کو بھی غصہ نہیں آتا۔ اگرچہ شاید آپ غصے میں آ جاتے ہیں جی ہاں' غصہ آنے کا زمانہ بیت چکا جبھی تو آج گھر والیاں گھروں کو چھوڑ کر انار کلی' کلب' ہوٹل اور سڑکوں پر گھومتی پھرتی ہیں اور دواخانے زوروں پر ہیں اور اسمبلیوں میں ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آتی اور چینی کے ڈپو بھیڑ کے باوجود کھلے رہتے ہیں اور بحالیات کے دفتروں کو آگ نہیں لگتی اور .... اور ہڑتالیں ہوجاتی نہیں۔ اور گاندھی جی کا بڑا نام ہے اور کشمیر کا مسئلہ یو این کا محتاج ہے اور کنہیا لال کپور کی "سنگ وخشت" بکتی ہے اور میں اپنی روٹی آپ پکاتا ہوں اور غصے کا مرثیہ لکھ رہا ہوں۔

آجکل جب ہم راہ میں گہری کھائی دیکھتے ہیں تو خطرہ محسوس کر کے جھجکتے ہیں رکتے ہیں۔ واپس آتے ہیں اور پھر دوڑ کر آتے اور کھائی پر سے کودنے کیلئے سوچتے ہیں۔ آگے بڑھنا ضروری بھی ہے کیا؟ کھائی کی بات نہیں .... ایسی بیسیوں کھائیاں پار کیں ہم نے ویسے آگے بڑھنے کا فائدہ بھی ہے کچھ؟ اور فرض کرو پار ہی کرنا ہے اسے تو ذرا انتظار ہی کیوں نہ کر لیں پانی سوکھ جائے گا تو پار کر لیں گے ذرا بھیگنے سے بچ جائیں گے۔ شاید آپ کو اتفاق نہ ہو .... ایسے لوگ بھی ہیں جو کھائی پار نہیں کرتے اور یوں دکھائی دینے کا کمال رکھتے ہیں جیسے ابھی کھائی پار کر کے آ رہے ہوں .... میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ طریقہ بہتر ہے۔ "ہونے" پر نظر آنے کی فوقیت کو کون نظر انداز کر سکتا ہے۔ نظر غائر سے دیکھا جائے تو پر کمٹیگ زاویہ نگاہ سے غصہ آنا یا غصہ میں آنا چنداں مختلف نہیں۔ ہر شخص نے غصہ میں آنے کی مخصوص اور منفرد تفصیلات پیدا کر رکھی ہیں جو موقعہ کے مطابق کام میں لائی جاتی ہیں اور جنہیں دیکھ کر انسان کا شعوری ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس موضوع کا سب سے بڑا فنکار بنیا ہے جو غصہ میں آتا نہیں' آنے کی دھمکی دیتا ہے۔ اس لئے بنیئے کا غصہ خالص غصہ ہوا اور چونکہ وہ دھمکی سارے بدن سے نہیں بلکہ صرف زبان سے تعلق رکھتی ہے تو اسے ادھار طاقت کی مدد کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ ظاہر ہے کہ دھمکی کی دھمکی دینا غصے کے فن کا کمال ہے۔

بچہ چھت پر چڑھ جاتا ہے اور ماں سے کہتا ہے "اماں دے پیسہ ورنہ میں لگا کودنے' یہ کودا میں ورنہ پیسہ دے" اگر وہ واقعی کوٹھے سے کود جائے تو کیا اسے پیسہ مل جائے گا؟

شاید ماں دو روپے ڈاکٹر کو دے دے۔ سیر بھر دودھ بھی پلا دے' لیکن یہ سب اس پیسے کی برابری نہیں کر سکتے جسے وہ پلے میں باندھ سکتا ہے۔ منہ میں رکھ کر چوس سکتا ہے۔ پکے فرش پر پہیے کی طرح چلا سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر جیسے جی چاہے خرچ کر سکتا ہے میں اس لڑکے اور بنیئے کی عقل پر حیران ہوتا ہوں جنہوں نے یہ بھید پا لیا کہ انسان خطرے سے نہیں ڈرتا جس قدر خطرے کی دھمکی سے

KitaabPoint.blogspot.com

محض اس خیال سے خطرہ آنے والا ہے!

اس فنکار کو کہتے ہوئے سنیئے "اب کے دے گالی پنسیری نہ اٹھا ماری تو ہاں اب کے دے" اس کا کام بھی چل جاتا ہے اور پنسیری اٹھانے اور دے مارنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرنی پڑتی۔ لاری کا تیسرا گیئر لگتا ہی نہیں نہ پاڑی پر چڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہو نکنے کی! اس بانداز کی فوقیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یوپی کے بامذاق لوگوں نے اسے اپنا لیا ہے اگرچہ کوائف بدل دیئے ہیں۔ پنسیری ٹٹولنے کی بجائے کسی دوست کی باہوں میں لپٹ کر چلانا شروع کر دیا۔ "چھوڑ مجھے وہ مزا چکھادوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا سالے کو چھوڑ تو......." پھر راہ گیروں نے ایسے فنکاروں کو یوں داد دینا شروع کی کہ واقعی اسے اس طرح روکنے تھامنے لگے گویا وہ پکڑا گیا ہو۔ پھر جب غصے کے اس انداز کی عظمت عام طور پر تسلیم کر لی گئی تو لوگ علانیہ کہنے لگے "تو منہ سے باتکرارے میں کہتا ہوں منہ سے بات کر تو" ان الفاظ سے وہ منہ سے کہلوانے کا نہیں بلکہ ہاتھ سے نہ کہلوانے کا پرچار کرنے لگے اور "پھر" کیا کہا...... پھر کہنا" کہہ کر حریف کی توجہ کہنے پر نہیں بلکہ نہ کہنے کی طرف مائل کرنے لگے۔ حتیٰ کہ غصہ ایک کارآمد اور بے ضرر کیفیت کا فنی اظہار ہو گیا۔ پھر عورتوں نے اسے اپنا لیا اور اسے لطیف تر بنانے کے علاوہ اس سے اور کام بھی لینے لگیں۔ غازہ کے طور پر استعمال کرنے لگیں۔ غصے کے ذریعے اپنی لوچدار آواز کو گلی کوچوں میں نشر کرنے لگیں روٹھ کر منانے کا سبق سکھانے لگیں۔

غصہ میں آنے کی سب سے بڑی وجہ آبرو اور خودداری سے متعلق ہوتی ہے یعنی ہمیں تب غصہ آتا ہے جب ہماری توہین ہوتی ہے۔ بے عزتی کا خطرہ ہوتا ہے۔ ناک کٹ جاتی ہے اور ناک کی عظمت کو کون کافر نہ مانے گا؟

ناک اونچی اور تیکھی ہو کر آریہ نسل کو کول دراوڑ اور منگولوں سے ممتاز کرتی رہی اس کی عظمت کرنے کے لیے "ذات پات" کا عالیشان ایوان تعمیر ہوا۔ اس لئے کہ لوگ اس کے اونچے تیکھے ہونے کو نظر انداز نہ کر سکیں لوگوں نے اس پر روغن لگا لگا کر عوام کو متوجہ کرنا شروع کیا تاکہ اپنی عورتوں کی عالی نسل کی نمائش کر کے دیگر قبائل کو انہیں بیاہ کر لے جانے پر مائل کیا جائے عورتوں کی ناک کے زیور ایجاد کئے گئے جو عالی نسل کے علاوہ کنوارپنے کی کیفیت کے بھی مظہر ہوتے تھے۔ نئی دلہن کی برتری واضح کرنے کے لیے بیاہ کے بعد بھی ناک کے زیور پہنے جاتے رہے۔ بالآخر قدرت نے ناک کے تحفظ کے لیے غصے کا سا مضبوط اور دلیرانہ جذبہ پیدا کیا اگر اس کے باوجود لوگ کہیں کہ ناک کوئی چیز نہیں تو ظاہر ہے کہ یہ جاپانیوں کا پراپیگنڈہ ہے۔ اگر لوگ ناک کی عظطمت سے منکر ہو جائیں تو اس قوم کی ناک محض بہنے والا غصہ بن کر رہ جاتی ہے اور اس احساس پر کہ وہ زکام اور نزلہ کا اڈا ہے اور بھی سڑک سڑک کرنے لگتی ہے۔ سڑک سڑک کرنے والی قوم بھلا کیا کر سکتی ہے۔ اس کے برعکس ذرا ناک کو اپنی عظمت سمجھ کر دیکھئے تو اس احساس پر کہ آپ کے

KitaabPoint.blogspot.com

منہ پر ایک اونچی لمبی ناک ہے معاً آپ کا منہاو پر کو اٹھ جائے گا ایسے حالات میں سڑک سڑک کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا جیسے جاپانیوں سے راہ رسم کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یعنی ایک ناک کو تسلیم کر لینے سے پاکستان کی سیاسیات سدھر سکتی ہیں۔

تو ظاہر ہوا کہ ناک بڑی چیز ہے اور غصہ اس کا محافظ یا اے ڈی سی ہے۔ جیسے ہر بڑے عہدے دار کے ساتھ ایک باوقار محافظ ہوتا ہے جو عام طور پر لال وردی اور چمکتی ہوئی پیٹی پہنے رہتا ہے۔

سنا ہے پرانے زمانے میں یہ سرخ پوش ایڈی کانگ کنگ کانگ سے ملتا جلتا تھا کہتے ہیں اس زمانے میں اگر کسی گھر میں بیٹھے ہوئے شریف آدمی کی ناک پر مکھی کاٹ لیتی تو وہ بھنا اٹھتا اور اپنی تلوار سونت کر اٹھ بھاگتا۔ فرض کیجئے دروازے پر اسے کسی دوست یا پڑوسی کی بھینس مل جاتی تو وہ ایک ہی وار میں اسے ڈھیر کر کے اطمینان سے واپس چلا آتا شاید یہ بات سچی ہو۔ کون نہیں جانتا کہ ہمارے بزرگ بے حد دانا اور بینا تھے۔ اس کے علاوہ ان کی روحانیت کا کیا ٹھکانہ تھا۔ یقینی طور پر مکھی اور بھینس کے تعلق کو ہم سے بہتر جانتے تھے۔ اس دنیا میں کونسی چیز ہے جسے کسی اور چیز سے براہ راست یا ضمناً تعلق نہیں۔ کہتے ہیں آسٹریلیا اور کینیڈا میں اناج کم ہو تو ناروے والے بھوکوں مر جاتے ہیں۔ پوری بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن شاید مطلب یہ ہے کہ ایسا ہو تو انگلستان کو اپنی خوراک خود پیدا کرنی پڑے اور وہ بندوق اور گولیاں نہ بنا سکیں اور اس لئے ناروے والوں کو نہ بھیج سکیں۔ ناروے والوں کو گولیاں میسر نہ ہوں تو وہ شکار نہ کر سکیں اور شکار نہ کریں تو کھائیں کیا۔ مجھے یاد ہے ایف اے کے کورس میں ایک ایسا ہی گورکھ دھندہ تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ جس شہر میں بلیاں زیادہ تعداد میں ہوں وہاں پھول بکثرت ہونگے اب خیال فرمایئے پھول اور بلیاں! اس سے تو مکھی اور بھینس ہی زیادہ قابل اعتبار ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا قطعی تجربہ نہیں چونکہ یا تو میری ناک ہے ہی نہیں اور اگر ناک ہے تو بیچاری کو اے ڈی سی نصیب نہیں۔ اب آپ سے کیا پردہ ہے میں نے اپنی آن کے تحفظ کا ایک علیحدہ طریقہ ایجاد کر رکھا ہے۔ وہ طریقہ چاہے آپ کو پسند نہ آئے لیکن اس سے اس کی برتری پر حرف نہیں آتا۔

بحیثیت تحفظ غصے میں ایک نقص ہے کیونکہ عام حالات میں بے عزتی ہو جانے پر غصہ کا ایڈی کانگ بڑھ کر وار کرتا ہے یعنی غصہ وہ لشکر ہے جو نمین سے منہ کڑوا ہو جانے کے بعد کھائی جاتی ہے۔ فرض کیجئے فلاں صاحب نے وہ بات کہہ دی جس سے میری بے عزتی ہوگئی۔ اب اگر میں غصے کی مدد سے فلاں صاحب کے منہ پر چانٹا مار بھی دوں تو بھی کیا۔ اس سے میری لٹی ہوئی عزت تو واپس نہ آسکے گی۔ یہ تو پولیس کی سی بات ہوئی کہ تاک میں بیٹھے رہے کسی کو جرم کرنے کا موقعہ دیا اور جب وہ مجرم بن گیا تو جھپٹ پڑے اس طرح تو مجرمانہ ذہنیت کی روک تھام نہیں ہوتی۔ البتہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ غصہ مزید بے عزتی سے بچا لے گا۔ لیکن پھر بے عزتی سے بچائے یا

KitaabPoint.blogspot.com

نہ بچائے میرے لئے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ چونکہ جب بے عزتی ہوگئی تو ہوگئی' کیا چٹکی بھر اور کیا سیر بھر۔ عقلمندوں کا قول ہے کہ بیماری کی روک تھام علاج سے کہیں بہتر ہے اور غصہ بیچارا ایک ایسی آٹومیٹک مشین ہے جو اس بات کی منتظر رہتی ہے کہ کوئی پھاڑے تو ایک دم ہی دوں رفو کردوں۔

میرا طریقہ تحفظ خالص روک تھام کے مترادف ہے اور بڑوں کے اس بڑے اصول کے مطابق ہے کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے یعنی میرا طریقہ دو لفظوں میں ذاتی توہین ہے پیشتر اس کے کہ کوئی میری بے عزتی کر سکے میں آپ اپنی توہین کر کے اپنے آپ کو بے عزتی سے اور کسی غیر سے بے عزتی کرانے سے محفوظ کرلوں گا۔ فرض کیجئے میں نے کوئی غلطی کی جس پر میرے افسر کا مجھے بے وقوف سمجھنے یا کہنے کا زبردست اندیشہ ہے تو صاحب میں فوراً کہہ دوں گا "دیکھئے حضور میں بھی کیسا بے وقوف ہوں" یا میری بے وقوفی ملاحظہ کیجئے صاحب' اور آپ جانتے ہیں سامنے پڑے کو تو بشر بھی نہیں کھاتا۔ کم عقل لوگ کہیں گے کہ اس طرح تو میں نے آپ ہی اپنی بے عزتی کردی لیکن یہی تو نکتہ ہے درحقیقت میں نے اس بھلے مانس کیلئے ناممکن کردیا کہ وہ مجھے بے وقوف کہے اس کے بعد میں کیا خاموش ہو جاؤں گا۔ پھر کہہ دوں گا۔ "صاحب بڑی محنت اور احتیاط سے غلطیاں کرتا ہوں کہ کہیں آپ کی برابری کی غلط فہمی کا شکار نہ بن جاؤں اس طریقے سے وہی شخص جو میری بے عزتی کرنے پر تلا ہوا تھا یقیناً ہنس پڑے گا اور میری پیٹھ ٹھونکنے سے بھی گریز نہ کرے گا۔ اس کے علاوہ اس کو گمان تک بھی نہ ہوگا کہ میں بے وقوف ہوں چونکہ جو شخص اس کی برتری کا قائل ہے وہ بے وقوف ہوسکتا ہے کیا' اور اگر کوئی مزید فقرہ نہ بھی کہا جائے تو کیا وہ شخص بے وقوف سمجھا جاسکتا ہے جو اپنی حماقتوں سے کما حقہ واقف ہو اور پھر سچائی اور رنگینی مفت۔

نہ جانے کیوں یا تو اپنی بے عزتی آپ کرنا بے عزتی ہی نہیں ی اسننے والے اس پر یقین نہیں کرتے۔ وہ سوچتے ہیں کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی بھلا مانس اپنی توہین آپ کرے' نہیں اس میں کوئی راز ہے۔ میرے بزرگ اور افسر صرف اس بنا پر مجھے عقلمند سمجھتے ہیں جب میں کہتا ہوں کہ جناب میں تو خالص بے وقوف ہوں اور وہ اخلاقاً جواب دیتے ہیں کہ نہیں صاحب آپ تو....... اور میں اس کے باوجود یہی رٹ لگائے جاتا ہوں تو انہیں اس بات پر غصہ آجاتا ہے کہ میں انہیں جھٹلانا چاہتا ہوں۔ اور وہ رعب اور شدت سے مجھے جھٹلاتے ہیں اس عمل میں انہیں میری عقلمندی پر یقین کرنا لازم ہو جاتا ہے اور میں راضی برضائے کے سے انداز میں چپ ہو جاتا ہوں۔ اگر بار بار دہرانے سے خدانخواستہ مجھے اپنی بے وقوفی کا گمان ہونے لگے تو مجھے اس قدر اطمینان ہوتا ہے کہ کیا کہوں۔ اس وقت میں اپنے آپ کو مہذب ترین انسان سمجھتا ہوں چونکہ اپنے آپ کو حقیر سمجھنے پر کلچر کا دارومدار ہے۔

ہاں اس طریقہ تحفظ کے خلاف یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی صاحب اس قدر جلد باز ہوں کہ حفاظت کرنے کا موقعہ ہی نہ دیں اور وہ

KitaabPoint.blogspot.com

بات کہہ دیں جس سے ہماری خودداری کو ٹھیس لگ جائے تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایسے موقعہ پر غصہ ہی کام آ سکتا ہے۔ یعنی ذاتی توہین آگے آگے اور غصہ پیچھے پیچھے! اس صورت میں مکمل حفاظت ہو جاتی ہے۔ جیسے ڈولی میں بیٹھی ہوئی ہندوستانی عورت کے آگے پیچھے کہار ہوتے ہیں۔ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا لیکن سچی بات پوچھئے تو جلد باز پر غصہ کرنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ ایک عام سا جلد باز بھلا غصے کو کیا سمجھے گا۔ اور اس فنی اور جمالی خوب یلو کیا جانے گا جلد باز بے وقوف ہوتے ہیں اور یوں ہاتھ چلاتے پھرتے ہیں جیسے ڈوبتا تنکے کا سہارا تلاش کر رہا ہو۔ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ مقابل طاقتور ہے یا کمزور۔ اور سچ پوچھئے....... تو طاقت جلد بازی کا دوسرا نام ہے اور جلد باز اندھے ہوتے ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ اندھے ہو جانے کی کوشش کی لیکن پھر بھی میری آنکھوں میں اس قدر بینائی ضرور رہ جاتی ہے کہ حریف کے تنے ہوئے پٹھے نظر آ سکتے ہیں۔

ہاں تو غصہ ایک مشین ہے جو عزت کی پھٹی پرانی چادر کو سینے اور رفو کرنے میں لگی رہتی ہے۔ آپ مجھے غصے میں جو چاہے کہہ دیں۔ گالیاں دے لیں۔ منہ چڑا دیں۔ چاہے آپ کی آنکھیں اس وقت پھیل پھیل کر مجھے اپنی بے عزتی کا قائل کرنے کی کوشش کریں یا چہرہ سرخ انگارہ ہو کر اپنے جوش اور قوت کا یقین دلائے چاہے آپ آستین چڑھانا بھی شروع کر دیں مجھے آپ پر قطعی غصہ نہ آئے گا بلکہ میں یوں محسوس کروں گا جیسے کوئی غریب اپنی گدڑی سی رہا ہو اور میرا جی چاہے گا کہ آپ کو گلے لگا کر رو پڑوں۔

لیکن اگر آپ ٹھنڈے دل سے یعنی جھجک کر مجھے کچھ کہہ دیں" بے وقوف " ہی سہی اور مجھے اس قدر مہلت نہ دیں کہ میں خود اپنے آپ کو بے وقوف کہہ کر آپ کو تکلیف کرنے سے بچا لوں....... تو....... تو مجھے غصہ آ جائے گا۔ ہاں غصہ آ جائے گا اور پھر نہ جانے میں کیا کر بیٹھوں۔ اس کے بعد آپ یہ نہ کہیے گا کہ میں مہذب نہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

جھوٹ

میں نے اظہر کو بلا کر کہا'' اظہر تمہارے ابا شکایت کرتے ہیں کہ تم بہت جھوٹ بولتے ہو'' اظہر کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے حیران اور ڈری ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا'' نہ........ نہیں جی میں جھوٹ نہیں بولتا........ پر ابا جی مارتے ہیں'' ان مختصر الفاظ میں اس چھوٹے سے لڑکے نے جھوٹ کا تمام فلسفہ بیان کر دیا۔ یعنی مخصوص حالات میں جھوٹ ایک کارآمد چیز ہے جو زیادہ تر اپنے بچاؤ کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ جس طرح عالم طفلی میں بچوں پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ماں کی محبت حاصل کرنے کے لیے رونا' روٹھنا' ضد کرنا اور بیمار پڑ جانا بہت مفید ہے۔ اسی طرح کسی روز ان پر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ابا کی تیوریوں اور ماسٹر کی مار پیٹ سے بچنے کے لیے جھوٹ بولنا بہت ضروری ہے۔ یعنی جھوٹ ایک آرام دہ اور کارآمد ایجاد ہے جو عام لوگوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔

حسین عورتوں اور بڑے سیاست دانوں نے جھوٹ کو آرٹ کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔ غالباً اس لئے کہ انہیں جھوٹ بولتے ہوئے اس کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ عورتوں کے لیے گھر گرہستی کی زندگی میں جھوٹ ایک ایسی ہی آرام دہ چیز ہے جیسے خانہ داری کی اور چھوٹی موٹی چیزیں مثلاً چوکی' چمچہ' پیالہ یا دست پناہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ نمائشی جھوٹ بھی ہوتے ہیں جو ان کے لیے ایک خوبصورت ساڑھی یا کاجل اور پاوڈر کا کام دیتے ہیں وہ جھوٹ کی مدد سے صرف اپنا بچاؤ ہی نہیں کرتیں بلکہ دوسروں کو مغلوب کرنے کے لئے بھی کئی دلچسپ اور انوکھے ایجاد کرتی رہتی ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ جھوٹ کی دلچسپ اور رنگین ایجاد کے لیے ہم سب کسی عورت کے مرہون منت ہیں۔

اتنا جھوٹ بولنے کے باوجود بھی مرد ابھی تک دروغ گوئی میں وہ لطافت پیدا نہیں کر سکے جو ایک چھوٹی سی لڑکی اپنے ایک سرسری جھوٹ میں پیدا کر لیتی ہے۔ شاید اس لئے کہ مرد بہت سوچ بچار کے بعد جھوٹ بولتا ہے حتیٰ کہ اس کے جسم کا بند بند یہ جان لیتا ہے کہ ابھی ایک جھوٹ بولا جائے گا اس طرح یہ راز اس کے تمام جسم میں مشتہر ہو جاتا ہے۔ عورت پر جھوٹ بولتے ہوئے ایک بے خودی کی سی کیفیت چھا جاتی ہے جیسے وہ کوئی شعر کہہ رہی ہو۔ اس لئے اس کے جھوٹ کو سوچ بچار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

شاید آپ نے بھی کبھی جھوٹ بولنے کی کوشش کی ہو اور یہ محسوس کیا ہو کہ جھوٹ بولتے ہوئے دل یوں دھڑکنا شروع کر دیتا ہے

KitaabPoint.blogspot.com

گویا کہہ رہا ہو" بھئی تم جانو تمہارا کام میں اس بات میں دخل نہیں دیتا" آنکھیں قطعی بھول جاتی ہیں کہ ان حالات میں انہیں کس قدر کھلا رہنا چاہیے اور کدھر دیکھنا چاہیے ہاتھ حیرانی میں شانوں سے نیچے یوں آوارہ لٹکتے ہیں گویا کسی لامتناعی خلا میں آویزاں ہوں۔ اس وقت آواز بھی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کا ساتھ نہیں دیتی جیسے کوئی دردبھرا گیت چانت سروں میں گایا جارہا ہو اور جسم کی نس نس ہم کو جھٹلانا شروع کر دیتی ہے" جھوٹ' جھوٹ" اس کے باوجود اگر کوئی ہمارے جھوٹ کو سچ مان لے تو یہ اس کا حسن اعتقاد ہے۔

ہم صرف زبان ہی س ے جھوٹ بول سکتے ہیں اور وہ بھی صرف لفظوں کی مدد سے ہمارے باقی اعضا اس وقت زبان کا ساتھ نہیں دیتے۔ اکثر تو اس کی دیدہ دلیری پر حیران ہو جاتے ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی نیکی یا بزدلی سے زبان کو جھٹلانا شروع کر دیتے ہیں۔

میرا اپنا تجربہ ہے کہ جھوٹ بولتے ہوئے اس قدر پریشانی اور پشیمانی ہوتی ہے کہ معاول میں یہ آرزو پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر اب کی بار خفت سے بچ جاؤ تو گزشتہ گناہوں سے توبہ کر کے باقی عمر اللہ کی یاد میں بسر کر دوں گا۔ شاید اسی ڈر کے مارے میں زیادہ تر جھوٹ بولنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یعنی راست گوئی میرے لئے ایک ناخوشگوار مجبوری ہے اور اس لئے زندگی ایک خشک اور پھیکی حقیقت۔

اس کے برعکس کسی کے جھوٹ پر ایمان لانے کے متعلق....... آپ مجھ سے کتنا بڑے سے بڑا جھوٹ بولیں۔ میں آپ کی بات پر سچے دل سے ایمان لے آؤں گا۔ بولتے ہوئے چاہے آپ کا دل دھکا دھک سے کچھ ہی کیوں نہ کہے' منہ پر ایک رنگ آئے اور ایک رنگ جائے' آنکھیں بھینچی رہیں یا پھٹی ہوئی میں آپ کی بات تسلیم کر لوں گا۔ چونکہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کرنے کی مجھے عادت نہیں۔ پھر کبھی کسی وقت بیٹھے بٹھائے میرے دل میں یکلخت خیال آئے گا کہ اس روز آپ نے میرے روبرو غالباً جھوٹ بولا تھا ہاں واقعی جھوٹ تھا....... صریحاً جھوٹ۔ یعنی بالکل جھوٹ سفید جھوٹ۔ اس وقت میرا جی چاہتا ہے کہ اٹھ کر ٹوپی سر پر رکھوں' گھر سے نکلوں اور آپ کو کان سے جا پکڑوں اور صاف صاف کہہ دوں اس روز آپ نے مجھ سے سفید جھوٹ بولا تھا۔ شاید آپ کا خیال ہے کہ میں ابھی بچہ ہوں اور جھوٹ سچ کی تمیز نہیں رکھتا....... پھر اٹھنا ٹوپی سر پر رکھنا اور اتنی دور چل کر جانا محض اپنی فہم رسا کا ثبوت اور آپ کو ہدایت دینے کے لیے؟ اس خیال کے آتے ہی پھر بیٹھ جاتا ہوں اور بات آ گئی ہو جاتی ہے۔

اگر جھوٹ بولنے اور جھوٹ پر ایمان لانے میں لوگ مجھ ایسے ہی واقع ہوئے ہیں تو ہم سب فطری طور پر راست گو ہیں۔ البتہ ہم جھوٹ پر ایمان لا سکتے ہیں یعنی انسان فطرتاً کافر نہیں بلکہ مومن جانور ہے اور ہماری جملہ مشکلات کی وجہ ہماری دروغ گوئی نہیں بلکہ خوش اعتقادی ہے اس کے باوجود ہمیں ہمیشہ سے یہی تلقین کی گئی کہ جھوٹ نہ بولو۔ یہ نہیں کہ جھوٹی باتوں پر ایمان نہ لاؤ۔ اس کی وجہ

KitaabPoint.blogspot.com

شاید یہ ہو کہ ہر ریفارمر کو جس نے انسان کو جھوٹ سے پرہیز کی تلقین کی بذات خود لوگوں کے حسن ایمان یا خوش اعتقادی کی ضرورت تھی یا شاید اس لئے کہ اسکا خیال تھا کہ اگر سب لوگ جھوٹ بولنا چھوڑ دیں تو جھوٹی بات کا وجود ہی نہ رہے گا اور جھوٹ پر اعتقاد کا سوال پیدا ہی نہ ہوگا۔ بہر صورتحال انہیں یہ خیال نہ آیا کہ یہ بات ایک ''اگر'' پر موقوف ہے اور ہر حرف شرط ایک نہ سلجھنے والا تانا بانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ قطعی بھول گئے کہ جھوٹ نہ بولنے کی تلقین سے کہیں ضروری ہے کہ لوگوں میں سچی بات سننے اور برداشت کرنے کی ہمت پیدا کر دی جائے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ ہم سب خوش اعتقاد واقع ہوئے ہیں تو ظاہر ہے کہ خوش اعتقادی ہمارے لئے مفید ہے۔ کیونکہ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ انسان سا عقلمند جانور کسی غیر مفید بات کو پلے سے باندھے۔ ہم صرف ان باتوں پر ایمان لے آتے ہیں جن سے ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اعتقاد یا ایمان ہمیں قبول نہیں جب تک وہ ہمیں خوشی نہ بخشے یعنی ہم کسی بات پر اعتبار نہیں کرتے بلکہ خوش کن اعتباروں کو اکٹھا کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ہم صرف وہی جھوٹ بولتے ہیں جو ہمارے لئے خوش کن ہوں۔ اس لئے عام طور پر اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ میرے روبرو جھوٹ بول رہے ہیں تو میرا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کی بات مجھے اچھی نہیں معلوم ہو رہی یعنی وہ میرے اکٹھے کئے ہوئے اعتقادات کو جھٹلا رہی ہے یا وہ میرے مطلب کے مطابق نہیں۔

اگر آپ مجھ سے کہیں تو اسے تسلیم کر لینا یا نہ کرنا آپ کے بیان کی سچائی یا جھوٹ پر مبنی نہیں ہے۔ آپ کوئی جھوٹ بول کر مجھے خوش کر دیں تو میرے نزدیک آپ بہت راست گو ہیں۔ یعنی جھوٹ اور سچ بذات خود ہمارے نزدیک غیر ضروری اور مہمل باتیں ہیں۔

اگر سننے والا سنانے والے کے نقطہ نظر سے بات سنے تو جھوٹ کا وجود ہی نہیں رہتا کیونکہ ہر باتمیں کسی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے چاہے وہ حقیقت کی بات میں ظاہر ہو یا اس کے ان کہے حصے میں۔ اس طرح دنیا چند ساعت کے لیے جھوٹ اور سچ کی مصنوعی بندشوں سے بلند تر ہو جاتی ہے۔ آپ سنانے والے کی مجبوری سے ہمدردی محسوس کرتے ہیں اور جی ہاں بالکل درست کے ہمدرد جملوں سے اسے تھپکتے ہیں۔ ادھر کہنے والا آپ کے یہ ملائم الفاظ سن کر سمجھتا ہے کہ آپ خوب آدمی ہیں۔ خوب سمجھتے ہیں آپ۔ ماشاءاللہ اس وقت آپ کے دل میں دنیا بھر سے ہمدردی کا جذبہ امڈ آتا ہے اور کہنے والے کے دل میں آپ کی نکتہ شناسی کی دھاک بندھ جاتی ہے۔ یعنی اگر لوگوں کو جھوٹ سننے کی تمیز ہو تو جس قدر جذبہ ہمدردی جھوٹ پیدا کرے گا شاید کوئی اور بات نہ کر سکے۔

عام طور پر چار قسم کے جھوٹ بولے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ جنہیں بولتے ہوئے واضح طور پر احساس ہوتا ہے کہ جھوٹ بولا جا رہا

KitaabPoint.blogspot.com

ہے۔ایسے جھوٹ اکثر بچاؤ‘ مطلب براری‘ آن قائم رکھنے کی غرض ہے یا کسی ذاتی فائدے کے لئے بولے جاتے ہیں گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ سب باتیں حقیقتاً اپنے بچاؤ ہی کے لیے ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ جھوٹ جو تقاضاً بولے جاتے ہیں اور بولنے والے کو قطعی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا اگر ہو بھی تو ایک دھندلا سا شک ہوتا ہے جو اس کی نفسی کیفیت پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ ایسے جھوٹ صرف عورت ہی بول سکتی ہے۔ صرف یہی جھوٹ آرٹ کے درجے تک پہنچ سکتے ہیں۔ عورتوں کے علاوہ شاعر مصور اور دیگر آرٹسٹ بھی اس قسم کے جھوٹ بولنے کی قابلیت رکھتے ہیں شاید ان لوگوں میں عورت کا عنصر غالب ہوتا ہے۔

تیسری قسم کے جھوٹ وہ جھوٹ ہیں جنہیں بولتے ہوئے ہمیں پختہ یقین ہوتا ہے کہ ہم حقیقت کو بے نقاب کر رہے ہیں اور ہمیں حیرانی ہوتی ہے کہ ایسی سیدھی بات سننے والے کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ اس قسم کے جھوٹ بولنے سے پیشتر یہ لازم ہے کہ وہی جھوٹ ہم اپنے آپ سے اتنی بار بول چکے ہوں کہ وہ ہمارے لئے جھوٹ ہی نہ رہیں۔ ایسے جھوٹ عام طور پر جاہل لوگ‘ سپاہی‘ سیاست دان‘ امرا اور فلسفی بولتے ہیں۔

چوتھی قسم کے وہ مہذب جھوٹ ہوتے ہیں جو ہم لوگوں کو خوش رکھنے کے لئے مروجہ تہذیب اور اخلاق کے مطابق بولتے ہیں۔ یہ جھوٹ اپنے متعلق پروپیگنڈا ہونے کے علاوہ اجتماعی زندگی میں بے حد ضروری ہیں۔

ان کے علاوہ ہم بسا اوقات میں یا جب ہمیں کوئی کام نہ ہو بیٹھے ہوئے اپنے آپ سے بولتے رہتے ہیں۔ مجھے بھی اس کی عادت ہو چکی ہے۔ صبح دفتر جانے کے لیے جب میں اپنی بائیسکل پر پاؤں رکھتا ہوں تو معاً میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں وہ مشہور ہواباز ہوں جسے لندن سے سڈنی تک کا سفر چوبیس گھنٹے میں طے کر کے ریکارڈ قائم کرنا ہے۔ پھر میری بائیسکل ہوائی جہاز بن جاتی ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ نیچے دنیا بھر کے لوگ منہ اٹھا اٹھا کر میری طرف دیکھ رہے ہیں اور شہر بھر میں اس پاکستانی ہواباز کی ریکارڈ توڑنے والی پرواز کی خوشی میں موٹریں‘ لاریاں اور تانگے چلتے پھرتے ہیں۔ لوگ یوں خوش نظر آتے ہیں گویا کسی بیاہ پر آئے ہوئے ہوں۔ تانگے والے بیچارا بھائی‘ ہٹو ہٹو چیخ چیخ کر میرا راستہ صاف کرنے میں مصروف ہیں...... اکثر مرتبہ میں جاگ پڑتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کسی دن یہ ہوابازی مجھے کسی لاری کے نیچے نہ کچل دے لیکن آپ جانتے ہیں کہ لندن سے سڈنی تک پرواز کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ البتہ مجھے اس خیال سے بے حد دکھ ہوتا ہے کہ کسی روز اگر میں مر گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ ایک بائیسکل سوار اپنی حماقت کی وجہ سے لاری کے نیچے آکر مر گیا۔ بے چاروں پر کوئی اس حقیقت کا انکشاف کرنے والا نہ ہوگا کہ وہ بظاہر سائیکل سوار در حقیقت وہ مشہور ہواباز تھا جو چوبیس گھنٹے میں لندن سے سڈنی تک پرواز کرتے ہوئے اپنے مہماتی جذبے کی نذر ہو گیا۔

KitaabPoint.blogspot.com

میں نہیں جانتا اس ریکارڈ توڑنے والی ہوابازی سے میرا مطلب کیا ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ کہ میری سائیکل اتنی پرانی ہے کہ چلتے ہوئے اس میں سے کئی ایک دلچسپ قسم کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ خود یوں جھولتی ہے کہ اس پر ب۔ٹھ کر لوگوں کو اپنی طرف دیکھنے اور گھورنے سے باز رکھنا ممکن نہیں اور چونکہ مجھ میں ایسی نگاہوں کے برداشت کرنے کی ہمت نہیں اس لئے خیال ہی خیال میں میں نے اسے ایک ہوائی جہاز بنا رکھا ہے یا یوں کہئے کہ میں اس سائیکل پر بیٹھنے سے بچنے کے لیے ہوابازی کا عادی ہو چکا ہوں۔ یعنی اپنے بچاؤ کے لیے میں اپنے آپ سے یہ معصوم اور خوش کن جھوٹ بولتا ہوں جب کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے اس بات کا خیال آتا ہے تو میں محسوس کرتا ہوں کہ دنیا میں سب جھوٹ بولنے والے لوگ کس قدر ترس کے قابل ہیں گویا وہ سب لولے لنگڑے اپاہج ہیں جو اپنے ہونے، جینے یا چلنے پھرنے کے لیے سہارا ڈھونڈتے پھرتے ہیں جو ان سہاروں کے بغیر حرکت نہیں کر سکتے اس وقت مجھے ان لوگوں پر بے حد غصہ آتا ہے جنہوں نے ہمارے دل میں جھوٹ اور جھوٹوں کے لیے اس قدر نفرت پیدا کر رکھی ہے۔

ہمیں اپنے آپ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا حقیقت میں ایک ایسی ٹیڑھی کھیر ہے جس کا نہ سر نہ پیر اور جس میں ہماری کوئی وقعت نہیں تو ہمارا دل بیٹھ جاتا ہے جیسے لامحدود گہرائیوں میں ڈوب رہا ہو۔ اس وقت اپنے آپ کو بچانے کے لیے ہمیں چند خوش کن اعتباروں کی ضرورت پڑتی ہے جو ہمیں تسلی دے سکیں اور جن کے سہارے ہماری اپنی شخصیت کی اہمیت پیدا ہو۔ انہی خوش کن اعتقادوں سے جنہیں عام طور پر ذاتی لاگ لگاؤ کہا جاتا ہے ہماری دنیا قائم ہے اور انہی کی مدد سے ہم میں احساس انفرادیت پیدا ہوتا ہے۔ یعنی ان کو اکٹھا کر لیا جائے تو ایک ''میں'' بن جاتی ہے۔ اگر میں کا احساس نہ ہو تو دنیا بکھر کر اک طوفان بدتمیزی ہو جائے۔ فطرت نے ہمیں ''میں'' کا احساس دے کر زندگی کو زندگی بنا دیا ہے۔ شاید ''میں'' کے پردے میں فطرت خود چھپی بیٹھی ہو اور ہماری فطری دروغ نوازی کی وجہ سے ہمارے لئے اندھیرا اندھیرا اور اجالا اجالا ہو۔ ہماری خوش اعتقادی ہماری مشکلات کی وجہ نہیں بلکہ ہمارے لئے زندگی ہے ''میں'' ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

عورت اور جنسیات

جنسیات کی رو سے جسم کا وہ حصہ جو خواہشات پر اثر نہیں رکھتا محض دکھاوا ہے اس لئے عورت اور مرد کا امتیاز جسم کے سطحی اختلافات پر منحصر نہیں ہوسکتا۔ چونکہ یہ سطحی اختلافات افراد کی خواہشات پر اثر انداز نہیں ہوتے جسم سے جسم کی بیرونی شکل مراد لینا اور انسان کو مرد اور عورت میں تقسیم کرنا غلطی ہے۔

ترتیب دینا بذات خود محدود تصور کا وصف ہے اور انسانی تخیل کے عجز پر دال ہے۔ فطرت ترتیب سے بلند تر اور بیگانہ ہے چونکہ ہمارا تخیل محدود ہے ہم غیر ترتیب شدہ کائنات کا احاطہ نہیں کر سکتے اس لئے چیزوں کو سمجھنے کی خاطر اپنی آسانی کے لیے ہمیں ایک نہ ایک ترتیب ایجاد کرنا پڑتی ہے اور پھر اپنے عجز پر پردہ ڈالنے کے لیے ہر اصول کے ساتھ مستثنٰے کی کلی ٹانکنی لازم ہوجاتی ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ مرد اسے کہتے ہیں جو بظاہر مرد نظر آئے یا جس نے پگڑی باندھ رکھی ہو۔ لیکن جسم کی بیرونی شکل یا پگڑی قابل اعتبار نہیں ڈھکے ہوئے مرتبان کو دیکھ کر ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس میں مربہ ہے یا اچار لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتے چونکہ چیونٹیوں کی بات پر اعتبار کر لینا کافی نہیں۔ تو جسم کی بیرونی ساخت سے اندرونی خواہشات کا صرف اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو کسی صورت میں یقینی نہیں ہوسکتا۔ کسی فرد کا مرد یا عورت ہونا ان خواہشات پر مبنی ہے۔ جنکا حامل جسم ہوتا ہے۔ جنسیات کے گورکھ دھندے میں ہمیں کئی ایک باتوں کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ مثلاً جسم کی بیرونی اور اندرونی ساخت' آرزوئیں شعوری اور لاشعوری اور وہ رجحانات جو ہویدا نہیں ہوتے بلکہ تاک میں بیٹھے رہتے ہیں کہ موقع ملے تو جھپٹ کر کسی انفرادیت پر چھا جائیں۔

جنسیات کے اس الجھاؤ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ فلاں جنس کونسی ہے اور فلاں کونسی اور کسی ایک جسم میں فلاں جنس کہاں شروع ہوئی اور کہاں ختم۔

سنا ہے پرانے زمانے میں مرد اور عورت ایک جسم میں رہا کرتے تھے۔ ہماری تاریخ کے جملہ سرچشموں میں سے بت' سکے اور پرانی کتابیں اس امر کی شاہد ہیں پھر نہ جانے کس بات پر دونوں کا جھگڑا ہوگیا اور وہ اس افراتفری میں ایک دوسرے سے جدا ہوئے کہ ایک دوسرے کی کئی ایک چیزیں اور خصوصیات دوسرے کیپ اس رہ گئیں جبھی سے ہر جسم میں عورت اور مرد کی خصوصیات خلط ملط ہو رہی ہیں۔ ہر مرد میں داڑھی مونچھ کے باوجود عورت گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہے اور ہر عورت کے گھونگھٹ تلے مرد چھپا ہوا ہے۔ یعنی

KitaabPoint.blogspot.com

کسی فرد کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں مرد کہاں ختم ہوا اور کہاں عورت ابھر آئی۔ مرد اور عورت کا یہ اختلاط بذات خود اس عظیم الشان تو اریخی کو آپریٹو تحریک۔

CO-OPERATIVE MOVEMENT کا ثبوت ہے اور دونوں کی گزشتہ لڑائی آج بھی ''جنسی ضد'' کی صورت میں واضح ہے۔

مرد کے جسم میں نسائیت کا نفوذ کہیں اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اس میں ظاہری مرد پنے کے علاوہ کوئی اور مردانہ صف نہیں رہتا یعنی وہ صرف مردم شماری کا مرد رہ جاتا ہے۔ ایسے زنانہ مرد اکثر دیکھنے میں آتے ہیں جنہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے گویا مٹی کی ہنڈیا میں پاونڈ کریم رکھی ہو۔

یہ اختلاط جنسی صرف ذہنی اور جذباتی خصوصیات تک محدود نہیں رہتا بلکہ جسمانی اعضا تک پہنچ جاتا ہے ویسے تو اس تو اریخی جنسی ملاپ کا سانپ کئی ایک لکیریں چھوڑ گیا ہے جنہیں کئی ایک پٹنٹس نے بھی ہوں گے۔ کئی ایک نروں میں انڈے دانیاں نکلتی ہیں اور کئی ایک مادہ میں عجیب الجنس اعضا۔

عورت میں مردانہ پن عام سہی لیکن عام طور پر اس کی قدر تیز نہیں ہوتی کہ اسے نسائی کردار یا تقاضے سے بے نیاز یا بیگانہ کر دے غالباً اس کی وجہ ہے کہ تسلسل حیات زیادہ تر عورت کی ذات سے وابستہ ہے اور جہاں تک ہم سمجھتے ہیں کائنات کا مقصد صرف تسلسل حیات ہی ہے اس لئے عورت کا جسم براہ راست علم الحیات کے اصولوں یا قانون پر چلتا ہے۔ جسکے احکام نفس غیر شاعر کی راہ عورت تک پہنچتے ہیں۔ جن پر عمل کرنے پر وہ ازلی طور پر مجبور ہے۔ اسی وجہ سے عورت کی انفرادیت اس کے عورت پنے پر حاوی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کی انفرادیت کے صرف پہلو نشو و نما پا سکتے ہیں جو اس کے فرض اعلیٰ یعنی تسلسل حیات میں ممد اور معاون ثابت ہوں۔ یعنی مرد کی نسبت عورت پر جنسیت زیادہ غالب ہے اور جب اس کا عمد نسائیت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرے تو وہ بذات خود مفلوج ہو جاتا ہے اور اس کے جسم کے نقار خانے میں طوطی بن کر رہ جاتا ہے۔ کتنی بار بانہیں جھٹکنے کے لیے اٹھتی ہیں اور لپٹ جاتی ہیں۔ نفرت سے کھولتا ہوا جسم اپنا آپ حوالے کر دیتا ہے۔ چہرے کی زردی چھپانے کے لیے گال شرم سے تمتما اٹھتے ہیں۔ تھکی ہاری ٹانگیں ٹھٹکنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

آج جبکہ عورت علمی و ادبی سے لے کر سیاسی میدان تک نہ صرف مردوں کا مقابلہ کر چکی ہے بلکہ کئی ایک شاہراؤں پر مرد سے کہیں آگے نکل گئی ہے۔ مرد اور عورت میں ایسے امتیازات پیدا کرنا شاید جہالت سمجھا جائے۔ اس لئے یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ

KitaabPoint.blogspot.com

اس تفریق سے میرا یہ مطلب نہیں کہ عورت ان خصوصیات کی اہل نہیں جو آج تک مرد سے منسوب ہوتی رہیں بلکہ اس کے برعکس چونکہ وہ تسلسل حیات کی ذمہ دار ہے۔ جس کے لیے اسے مرد کو تسخیر کرنا ہوتا ہے اس لئے وہ ضرورت کے مطابق اپنے آپ کو ہر سانچے میں ڈھال سکتی ہے۔

تسخیر مرد کے عمل میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ قلعوں کی سی تسخیر نہیں کہ ہاتھی گھوڑے لئے آئے اور محاصرہ کرلیا۔ یا تسخیر ''غرناطہ'' کی رنج واپس جانے کی کشتیاں جلا دیں بلکہ یہ عمل ''تسخیر ٹرائے'' سے ملتا جلتا ہے جس میں توپوں اور ہتھیاروں کی بجائے ایک خوبصورت لکڑی کے گھوڑے کی ضرورت پڑتی ہے جسے محصورین دیوتا سمجھ کر آپ شہر میں گھسیٹ کرلے جائیں۔

قدرت نے عورت کو صرف تسخیر کرنے پر مامور نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی طریقہ تسخیر بھی متعین کر دیا ہے چونکہ قدرت نے عورت پر PASSIVITY زبردستی عائد کردی ہے ورنہ اگر وہ زبردست جنس بنادی جاتی تو شاید تسلسل حیات کے سوا یہاں کچھ دکھائی ہی نہ دیتا۔ فطری طور پر وہ یہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے پیار کرے۔ اور پیار وہی کرسکتا ہے جو عمد کا اہل ہو۔ چونکہ محبت کرنا فاعلی جذبہ ہے اور ایسا فعل لازم ہے جو کرنے والے سے تعلق رکھتا ہے جس میں زیادہ سے زیادہ کسی محبوب کا ہونا لازم ہے یعنی مرد عورت کے علاوہ کسی اور چیز سے بھی محبت کرسکتا ہے چاہے وہ جاندار ہو یا بے جان۔ اس کے برعکس عورت کی خواہش ہے کہ کوئی اسے پیار کرے یعنی وہ ایسا ''محبوب'' نہیں بناسکتی جو جاندار یا فاعلی نہ ہو۔ مرد کے لیے محبوب کا صرف ہونا وصال کے مترادف ہے لیکن عورت کے لیے نہیں۔ جب تک کہ محبوب کا عمد اور آرزو اس کی طرف مائل نہ ہوں اور محبوب کو محبت کرنے پر مشتعل نہ کریں۔

مرد صرف یہ چاہتا ہے کہ عورت ہو اور اپنا آپ اس کے حوالے کردے وہ اس کی نفسیت پر چھانا نہیں چاہتا لیکن عورت کے لیے فقط مرد کا ہونا کافی نہیں جب تک مرد کا عمد اور آرزو اس کے لیے وقف نہ ہوجائے تو ظاہر ہے کہ عورت کا فتجا نظر مرد کا جسم نہیں بلکہ اس کا عمد اور آرزو ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اس کی نفسیت پر چھا جانا چاہتی ہے۔

جب مرد کے دن موجودہ زمانے کے خودساختہ اقتصادی جھمیلوں میں کٹ جائیں شام تفریح گاہوں کی بھینٹ ہوجائے اور کل کا کام سرانجام دینے کے لیے رات کو گہری نیند سونا لازم ہوجائے تو عورت بیچاری چولہا چھوڑ کر رکٹ گراونڈ' کانفرنس' لیبارٹری' فیکٹری اور طیارہ گاہ میں نہ آئے تو تسخیر مرد کا کام کیسے سرانجام ہو۔ چنانچہ اس فطری فرض کو ادا کرنے کے لیے وہ اپنا میدان عمل وسیع کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے علاوہ ہر ''محبوب'' کا یہ فرض ہے کہ عاشق کی آرزو کو اپنی طرف متوجہ کرے چاہے اس کا نظام آرزو بدل دے تاکہ وہ اسے پیار کرنے لگے یا اپنے آپ کو اس نظام آرزو کے مطابق بنالے تاکہ اس کے لیے جاذب توجہ ہوجائے۔

KitaabPoint.blogspot.com

پنجاب میں بھی مرد کے بڑھتے ہوئے انہماک کے خلاف عورت کی صدائے احتجاج خونیں لباس کی شکل میں بلند ہو رہی ہے حالانکہ اس امر سے قطعی ناواقف ہے کہ سرخ کپڑے کو دیکھ کر سانڈ کیوں جوش میں آ جاتے ہیں یا بیاہ شادی پر سرخ جوڑے کیوں پہنے جاتے ہیں اور مہندی لگانے کا کیوں رواج ہے نہ جانے نفس غیر شاعر جھک کر کان میں کچھ کہہ دیتا ہے کہ وہ بن سمجھے جانتی ہے اور بن جانے سمجھتی ہے۔

عورت کی قوت تسخیر کا یہ عالم ہے کہ بیوی بھی (چونکہ بیوی کو ہم خالص عورت نہیں کہہ سکتے) ہاتھ پاؤں جمائے بغیر چند ایک ان جانی حرکات کی مدد سے خاوند کو دنیائے عقل و شعور سے گھسیٹ کر دنیائے جذبات میں لا پھینکتی ہے حتیٰ کہ اس کی آنکھیں انگارہ ہو جاتی ہیں اور جسم بھکاری۔

فطری طور پر مرد اس کھلنڈرے لڑکے کی طرح ہے جو مدرسہ سے بھاگ کر باہر آوارہ پھرنا پسند کرتا ہے۔ عورت مرد کو واپس گھر لا سکتی ہے لیکن گھر کا نہیں کر سکتی اگر مرد بسا اوقات یا عام طور پر باہر آوارہ پھرے تو عورت کو بھی کرکٹ گراؤنڈ' فیکٹری یا طیارہ گاہ میں جانا ہی پڑتا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ عورت کرکٹ اور طیارہ میں دلچسپی بالواسطہ نہیں بلکہ ایک حقیقی اور مثبت شوق ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ عورت کی فطری خصوصیات میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اس کی انفرادیت مرد کی رنگ جنسیت پر حاوی ہو رہی ہے۔ لیکن پھر بھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ عورت کی یہ تبدیلی کس حد تک تسلسل حیات سے انحراف کے مترادف ہے۔ شاید وہ مستقبل کے مرد کے ماحول اور جذبات کے مطابق پھیل رہی ہو تاکہ آئندہ تسخیر مرد ناممکن نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے اگر مرد گھر توڑنے کی فکر میں ہو حیا کو نااہلیت سمجھے اور ذہنی چمک کو نسائی آب پر ترجیح دینے لگے تو عورت ہرجائیت خودنمائی اور ذہانت کو نہ اپنائے تو کیا کرے۔

توارث کے موجودہ نظریے کے مطابق مرد کی ترتیب مخلوط سمجھی جاتی ہے اور عورت کی مفرد۔ مثلاً مرد ع ک ہے تو عورت ع ع۔ عورت کے کسی موروثی رجحان یا خصوصیات سے اثر پذیر ہونے کے لیے لازم ہو گا کہ وہ خصوصیات دونوں ع پر موجود ہو۔ ورنہ صرف ایک ع پر موجود ہونے کی صورت میں وہ خصوصیات اس پر حاوی نہ ہوئی بلکہ مخفی رہے گی۔ وہ بذات خود اس خصوصیت سے متاثر نہ ہو گی بلکہ اسے اپنی نرینہ اولاد اور مردوں میں بانٹ سکے گی جیسے مچھر بذات خود ملیریا کا مریض نہیں ہوتا لیکن اس مرض کو پھیلاتا ہے۔ اس کے برعکس مرد میں ہر توارثی رجحان مقابلتاً ہویدا ہو جاتا ہے تو ظاہر ہوا کہ عورت میں مرد کا نفوذ چاہے کسی حد تک ہو وہ مقابلتاً عورت کے فرائض جنسی سے اس قدر گریز نہیں کر سکتی۔ عورت میں نسائیت تمام تر عناصر سے غالب تر ہے۔ اور مرد کی تسخیر اس کا سب سے بڑا دوامی اور غیر شعوری جذبہ ہے۔ باقی اوصاف مثلاً حیا' زیر دستی' نزاکت وغیرہ جو اسے تسخیر میں مدد دیتے ہیں۔ بالواسطہ ہیں جو حالات

KitaabPoint.blogspot.com

اور ضرورت کے مطابق بدل دیئے جاسکتے ہیں۔ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ یہ ضمنی خصوصیات فیشن کے مطابق ادلتی بدلتی رہیں۔
سنا ہے پرانے زمانے میں جب بے حجابی کا دور دورہ تھا۔ مرد عورت کی بے باکی سے اکتا گیا اس کے جنسی جذبات آزاد جنسی ماحول اور روزمرہ اشتعال کی وجہ سے اس قدر ٹھنڈے پڑ گئے کہ کسی بے حیا عورت نے ضرورت وقتی کے ماتحت اسے از سرنو اکسانے کے لیے حیا ایجاد کر دی جس طرح برہنگی کے زمانہ میں کسی چالاک اور بے حیا نے کپڑے ایجاد کر دیئے تھے۔ تو ظاہر ہوا کہ کوئی خصوصیت چاہے ہم اسے نسائیت کا جزو لاینفک ہی سمجھتے ہوں بذات خود نسائیت سے اہم تر نہیں ہو سکتی بلکہ نسائیت کے اہم ترین مقصد یا تقاضہ ''تسخیر مرد'' کے تحت رہتی ہے۔ اگر آج عورت زیردستی چھوڑ کر غالبیت اختیار کر لے تو بھی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ چونکہ شاید ضرورت وقتی ہی ایسی ہو۔ بہر حال دیکھنے میں آتا ہے کہ آجکل مرد میں مجہولیت یا زبردستی بڑھ رہی ہے اور مقابلتاً عورتیں بے باک ہو رہی ہیں۔ عورت کی ادنیٰ ترین تبدیلی چاہے وہ لباس سے تعلق رکھے یا انداز سے مرد کی کسی چھپی ہوئی یا نمایاں آرزو کا پرتو ہوتی ہے اس کے برتاؤ کی کمترین تفصیل بھی اس کے دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں وضع ہوتی ہے۔ اسی بات پر نہ جانے کس نے کسی بحث کا اختتام کرتے ہوئے کہا تھا۔ بیگم صاحب آپ نے بالکل بجا فرمایا۔ عورت لطیف اور رنگین تر مخلوق ہے اور مرد بھدی' لیکن مرد کے نظام آرزو پر عورت حاوی ہے اور عورت کی خواہشات مرد پر مذکور ہیں۔ یعنی مرد کی خواہشات ان تمام تر لطافتوں اور رنگینیوں سے معمور ہیں جو عورت سے وابستہ ہیں اور عورت کی آرزوؤں پر مردانہ بھدا پن چھایا ہوا ہے۔
''حیات'' کے پیغام یا احکامات لاشعور کے ذریعے نشر ہوتے ہیں۔ جو عزم اور عمد کا مرکز اور منبع ہے اور جس میں ایسی گہری حیاتی قوتیں ہیں جو ماحول اور وقت سے قطعی بے نیاز ہیں۔ چونکہ ''حیات'' کو براہ راست عورت سے زیادہ گہرا تعلق ہے اس نے عورت کی زندگی زیادہ تر نفس لاشعور کی مدھم تال پر چلتی ہے۔ انسانی عقل صرف وہی بات سمجھ سکتی ہے جس میں کوئی نظام دکھائی دے اور جو ماحول سے تعلق رکھے شاید اسی لئے عورت کا برتاؤ آج تک ناقابل فہم سمجھا گیا اور اسے ابوالہول سے تشبیہ دی گئی جس کا جسم انسانی اور حیوانی اعضا سے مخلوط ہے۔
عورت کی نفسیات اس شخص کی سی ہے جو دورخے مزاج کے عارضہ کا شکار ہو چونکہ اس کی نفسیت پر کبھی انفرادیت حاوی ہوتی ہے اور کبھی نسائیت اگرچہ یہ دونوں خصوصیات کشمکش پیدا نہیں کرتیں وہ ایک دوسرے سے قطعی متضاد ہوتی ہیں بلکہ عام طور پر اسے اپنے دورخے پن کا احساس ہی نہیں ہوتا چونکہ نسائیت کا رخ لاشعوری اثر رکھتا ہے اور انفرادیت کا شعوری۔ اول الذکر رخ کا لاشعوری اثر رکھنے کا مقصد اسے تلخی انفعال اور پشیمانی سے محفوظ کر دینا ہے چونکہ قدرت کہیں کہیں قوت اور وقت کے بیجا تصرف سے احتراز کرتی

KitaabPoint.blogspot.com

ہے۔ اس کے علاوہ شعوری حرکات میں وہ رس نہیں ہوتا اور شعوری فعل اور حرکت سے واقف ہو اور اسے احساس ہو کہ وہ تسخیر کر رہی ہے جو ہر مسکراہٹ پر جان لے کہ وہ ہونٹوں کی مدد سے مبہم وعدے کر رہی ہے جو چاہے کبھی ایفا نہ ہوں یا ویسے ہی بنی نوع انسان کو جینے کی ترغیب دے رہی ہے اور جینے کے سیدھے سادھے عمل میں رنگ بھر رہی ہے تو یا تو وہ اس فطری پابندی کی قید کے خلاف اٹھ کھڑی ہو اور یا مروجہ اخلاق کے زیر اثر اس قدر پشیمان ہو کہ احساس گناہ سے دب کر رہ جائے اور یا شاید ان وضعی پابندیوں کو چھوڑ کر اپنے فطری فرض کو اعلانیہ اپنا لے۔ ہر صورت میں توازن قائم نہ رہ سکے گا جو بڑی حد تک مرد عورت کے مقدس کھیل کو قابل آرزو بنانے کا ذمہ دار ہے۔

پریم ساتھی ہونے کے باوجود مرد اور عورت دو اجنبی ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے پیغام اور دعوت حیات بن جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود مکمل طور پر ایک دوسرے سے واقف نہیں ہوتے بلکہ چاند کی طرح صرف ایک پہلو پیش کرتے یا دیکھتے ہیں۔ عورت کا اہم ترین مقصد تسخیر ہے اور وہ اس مقصد کو پیش پیش رکھتی ہے تو وہ مرد کا صرف وہ پہلو دیکھتی اور جانتی ہے جو تسخیر ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اپنے اس مقصد سے بے نیاز اور بے واسطہ ہو کر نہ تو دنیا کو دیکھ سکتی ہے نہ اپنے آپ کو۔ ہاں اپنے بچے کو دیکھ کر اسے بے لاگ خوشی ہوتی ہے جیسے کوئی راہی منزل مقصود پر پہنچ گیا ہو۔

خوشی حاصل کرنے کے لیے تلخ حقائق سے منکر ہو جانا تو مرد اور عورت دونوں میں موجود ہے لیکن مرد حقائق سے زیادہ دیر تک جی نہیں چرا سکتا بلکہ جلد ہی وہ ناخوشگوار حقائق کے خلاف جدوجہد کرنا شروع کر دیتا ہے یا کم از کم ان کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے لیکن عورت عمر بھر اپنی خیالی دنیا میں بسر کر سکتی ہے۔ مرد کا حقائق سے چھپنا ڈر پر مبنی ہے لیکن عورت کا اپنی دنیا بنا لینا درحقیقت ان تلخ حقائق کے خلاف کامیاب جدوجہد ہے چونکہ اس کا تصور اس قدر مکمل ہوتا ہے کہ ہر متصورہ بات اس کے احساسات پر واضح اثر چھوڑ جاتی ہے جیسے کہ حقیقی مشاہدہ بلکہ اگر وہ حقائق سے بے نیاز رہنے کا فیصلہ کر لے تو کوئی حقیقت چاہے وہ روبرو ہی کیوں نہ ہو اس کے احساسات پر اثر پذیر نہ ہو سکے گی۔

لڑکے کو مرد بننے تک گرگٹ کی طرح کئی ایک رنگ بدلنے پڑتے ہیں۔ لیکن لڑکی پیدا ہوتے ہی مکمل عورت ہوتی ہے۔ اگرچہ بلوغت اس کے نسائی انداز میں رنگ بھر دیتی ہے اور ان غیر شعوری رجحانات کو جو پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں نمایاں کر دیتی ہے۔ ابتدا میں لڑکے میں نسائی جھلک ہوتی ہے لیکن اس کے برعکس عورت بڑھاپے میں مردانہ خصوصیات پیدا کر لیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نسائیت ایک ایسا عنصر ہے جو پھول کی خوشبو کی طرح اڑتا رہتا ہے حتیٰ کہ ایک عمر میں عورت صرف دیکھنے کی عورت رہ جاتی ہے اس

KitaabPoint.blogspot.com

وقت اس میں نسائیت مدھم پڑ جاتی ہے اور ساتھ ساتھ انفرادیت ابھرتی آتی ہے۔ بڑھاپے میں عورتوں کو داڑھی مونچھ نکل آتی ہیں۔ مزاج میں مردانہ درشتی شدید انانیت اور بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔

تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے حاکم عورتیں بڑھاپے میں مردانہ وار حکومت کرتی ہیں شاید ملکہ الزبتھ اور میری سکاٹ اسی لئے دو مختلف قصے ہیں کیونکہ اول الذکر میں انفرادیت تھی اور موخر الذکر نسائیت کے رنگ میں بھیگی ہوئی تھی۔

کسی چھوٹی بچی کو "تا" کا کھیل کھیلتے ہوئے دیکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے کھیل نہیں سمجھتی چونکہ زندگی میں "تا" اس کے لیے سب سے بڑی حقیقت ہے بلکہ حقیقت میں زندگی اس کے لیے ایک مسلسل "تا" ہے صرف اس کی زبان ہی "تا" نہیں کہتی بلکہ تمام جسم اس دلچسپ عمل میں زبان کا ساتھ دیتا ہے۔ لڑکا اس کھیل میں اس قدر دلچسپی نہیں لیتا۔ اس کی چالاک مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ مذاق کر رہا ہے۔ لڑکے کو ایسے کھیل پسند ہیں جس میں کسی کو ستانے، دق کرنے اور پیٹنے کا موقعہ ملے۔ اگر "تا" کے کھیل میں لڑکی کا ساتھ نہ دیا جائے تو وہ سچ مچ روٹھ جائیگی اس کی "تا" والی نگاہ میں بچوں کا کھیل نہیں بلکہ دیدہ بینا کی جھلک پڑتی ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ جس قدر "حیا" کا اظہار آٹھ نو سال کی بچی میں پایا جاتا ہے بالغ لڑکی میں نہیں ہوتا۔ شاید اس عمر میں قدرت انہیں مشق کرنا سکھاتی ہو یا بلوغت میں یوں خواہ مخواہ شرما جانا عریاں اپیل کا احساس دیتا ہو۔

آٹھویں یا نویں سال میں بچیاں اس بات پر مصر ہوتی ہیں کہ انہیں مکمل عورت مان لیا جائے۔ وہ بڑی لڑکیوں کی حرکات وسکنات کو غور سے دیکھتی ہیں اور ان کی سی باتیں اور انداز پیدا کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے انہیں بڑی بالغ لڑکیوں کی برتری کا احساس ہے نہ جانے ان کے دل میں نو بلوغت کیوں احساس تکمیل پیدا کرتی ہے پھر وہ اپنے کو یقین دلانا چاہتی ہیں کہ وہ بالغ ہیں۔ ان سے محبت کی جا سکتی ہے۔ اس لئے وہ بے تحاشا جھینپتی ہیں۔ اپیل کی مشق کرنے کے لیے عام طور پر وہ کسی بڑے مرد کو چنتی ہیں۔ شاید اس لئے کہ ان کی عمر کے لڑکے اس بارے میں کورے ہوتے ہیں اور جوان بالغ لڑکیوں کو دیکھنے میں بے حد مصروف۔ ان کی حرکات کچھ ایسی ہوتی ہیں جن سے ظاہر ہو "اب تو میں جوان ہوں" "ہمیں سب جانتی ہوں" حتیٰ کہ دیکھنے والا بزرگ پریشان ہو جاتا ہے اور پھر جان چھڑانے کے لیے ہنس کر کہتا ہے "یہ بچے! انہیں کیا....... بے چارے معصوم!"

مندرجہ بالا سطور میں کہیں میں بتا چکا ہوں کہ عورت کی سرسری ترین حرکت اس کے نفس غیر شاعری عمیق گہرائیوں میں وضع ہوتی ہے اور عورت کے اندر اور جذبات کی ہر تبدیلی مرد کی کسی نمایاں یا مبہم آرزو کا پرتو ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مرد یا محبوب کی پسند کے مطابق ہو۔ چونکہ ہر جگہ کے مرد ایک سے نہیں اس لئے ہر جگہ علیحدہ انداز اپیل ہوتا ہے۔ مثلاً یورپ میں جہاں آجکل ذہانت کا دور

KitaabPoint.blogspot.com

ہے عورتیں اپنے انداز اور جذبات میں ذہانت کی جھلک پیدا کرنا جان چکی ہیں اگر چہ گمان غالب ہے کہ ذہنیت کی حقیقی نشوونما نسائیت کی ممد ومعاون نہیں ہوسکتی چونکہ ذہانت کے زیر اثر شعوری نفس کی لاشعور سے کشمکش ہو جاتی ہے اور عام طور پر افراد کو لاشعوری رجحانات کا شعور ہونے لگتا ہے۔ بہر حال نہ جانے کیسے' لیکن مغربی عورتیں ذہانت کی گہرائیوں میں جانے کے بغیر ایک خوبصورت ذہین انداز پیدا کرنے میں کمال حاصل کر چکی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک جیسوا بھی اپنے اجنبی ملاقاتی کو ہمدردی کا احساس دے کر اس مختصر ملاپ میں ذہنی رفاقت کا طلسم پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے برعکس شاید اس لئے کہ پاکستانی مرد غم خور عاشق کا پارٹ ادا کرنے میں خوش ہوتا ہے پاکستانی عورت بے نیازی اور لاپروائی کی اپیل پیدا کرتی ہے لیکن حالات بدل رہے ہیں۔ پہلے وفا اور عزت کی اپیل پیدا کرنا لازمی تھا جس پر بے نیازی کا سہاگہ خوب رہتا تھا۔ لیکن اب مغربی نقطہ نظر حاوی ہوتا جا رہا ہے اگر چہ ابھی مغربی اپیل کی خوبیاں پورے طور پر دیکھنے میں نہیں آتیں۔ کیونکہ عورت اور مرد کو مل بیٹھنے کی اجازت نہیں اس لئے یہاں کی لڑکی ان تمام اپیلی انداز سے محروم ہے جو روبرو بیٹھ کر عمل میں لائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً گاڑی یا موٹر میں بیٹھ کر وہ بچکولوں کے پردے میں بار بار ایک دوسرے سے ٹکرانے یا لمس کا احساس دینے کی اپیل پیدا نہیں کر سکتیں اور سامنے بیٹھ کر گفتگو کرنے کی اپیل سے قطعی محروم ہیں۔ اس لئے ان کی اپیل زیادہ تر چھپ جانے' گھونگھٹ نکال لینے' شرما جانے اور جھینپ جانے تک محدود رہی۔ ظاہر ہے کہ جن قیود میں انہیں تحفظ کے لیے ڈالا گیا انہوں نے انہیں قیود اور رسومات کو اپیل کا ذریعہ بنا لیا تا کہ وضع داری کی وضع داری رہے اور اپیل کی اپیل۔ اس کے علاوہ ڈھیرے ڈھیرے کئی اور انداز اپیل پیدا ہوتے گئے۔ چنانچہ لڑکیوں نے اس سلسلہ میں چھوٹے بچے کے وجود تک کو بہت مفید مطلب پایا کیونکہ وہ دور کھڑی ہو کر بچے کو کھلانے کے بہانے اسے چھاتی سے لگا سکتی تھیں اور اس کا منہ چوم سکتی تھیں اگر براہ راست چھاتی سے لگانے یا منہ چومنے کے امکان کا پتہ بتایا جائے تو گمان غالب ہے کہ دیکھنے والا یہ سمجھے گا کہ نہ جانے کیسے لوگ ہیں۔ کچھ ایسے ویسے ہی ہیں۔ لیکن بچے کو چومنا ایک معصوم حرکت ہوئی بلکہ یہ حرکت اس امر کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اس میں ایک حقیقی ماں کی جملہ خوبیاں موجود ہیں۔ کئی ایک قوموں کے مردوں کا خیال ہے کہ عورت میں سب سے بڑا وصف پیار کرنا ہے۔ وفا نہیں تو اگر وہاں کی عورتیں ایک وقت میں کئی ایک افراد کو پیار کر سکیں تو کوئی مضائقہ نہیں چونکہ مردوں کا غالب جذبہ حصول محبت یا لذت ہے۔

عورت کا برتاؤ' حرکات' انداز' فیشن' لباس اور شاید اخلاق بھی اپیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ گاؤن ٹخنوں تک لٹک جاتے ہیں اور کبھی گھٹنوں تک سکڑ کر پنڈلیاں عریاں کر دیتے ہیں۔ آستینیں ناخن تک ڈھلک آتی یا مونڈھے اور گلا ایک ہو جاتا ہے۔ برقعہ الاسٹک کی طرح سکڑ کر خم و پیچ واضح کرنا شروع کر دیتا ہے اور یا سیاہ ہو کر گورا رنگ نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مغرب میں پیٹ بھرنے والا

KitaabPoint.blogspot.com

کھانا گھر کھایا جاتا ہے اور حسین حرکات والا محفل میں شاید مشرقی عورت کا مذہب اور خدا بھی پاکیزگی کی اپیل ہو۔ مغرب میں تو عورتوں کے ''خیالات'' ''سوشلزم'' اور ''ذہنی چمک'' محض اپیل کا اندازہ ہیں۔ یونانی تہذیب کے زمانے میں عورت کا بھرا ہوا جسم خوبصورت سمجھا جاتا تھا تو عورتیں مٹیار ہوتی گئیں۔ آج کل پتلے جسم کو خوبصورت سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے عورتیں پتلا دبلا ہونا سیکھ رہی ہیں۔ یورپ کے مردوں نے پیروں کی خوبصورتی کی طرف توجہ دی تو یک دم پاؤں کی حفاظت کرنا فیشن میں آ گیا۔ پھر پاؤں کا خم نمایاں رکھا جانے لگا لیکن اس سے یہ قباحت نکلی کہ پنڈلیاں موٹی ہو گئیں اب نہ جانے انہیں سڈول کرنے کے لیے کیا طریقہ استعمال کیا جائے گا کئی ایک ایسی قومیں بھی ہیں جن کے مردوں پر کھدے ہوئے (ٹیٹو) جسم کی اپیل حاوی ہے حالانکہ جسم کو ڈھانپ دیا جا چکا ہے۔

یہاں کے مرد اس بات پر مصر ہیں کہ عورت میں بے وفائی نہ ہو (یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا وفا کو اس قدر اہمیت دے کر وہ عورت کو بے وفائی کی جانب مائل کرتے ہیں تا کہ غم خوری کی لذت حاصل کر سکیں) ان کے نزدیک سب سے بڑا جذبہ خدشہ رقابت ہے۔ اس لئے وہ عورت کو اپنانے میں بے حد جلد باز واقعہ ہوئے اسی لئے ہماری محبت کا نقطہ نظر شادی ہے مغربی خیال کے مطابق محبت اور شادی دو مختلف باتیں ہیں۔ جب کوئی جنسی تجربات سے اکتا جاتا ہے تو اپنے بچاؤ کے لیے بیاہ کر لیتا ہے۔

پاکستان میں آج کل عورت کے لیے مساوی حقوق کا علم بلند ہو رہا ہے۔ جہاں تک شرعی اور سیاسی حقوق کا تعلق ہے شاید مساوات ممکن ہو لیکن مرد اور عورت کے جنسی تعلقات میں مساوات ممکن نہیں۔ جیسے مندرجہ بالا سطور میں کہیں واضح کر دیا گیا ہے عورت کا محبوب صرف وہ ہو سکتا ہے جو ذاتی عمدگی کا اہل ہو۔ عورت کی خواہش مرد کے عمد کو تسخیر کرنا ہے جسم کو نہیں اور اسے بذات خود حصول سے اس قدر دلچسپی نہیں جس قدر کہ عمل حصول میں راحت ہے اگر مرد محبت میں اپنی انفرادیت اور عمدہ کھو دے تو ظاہر ہے کہ عورت کے لیے اسے تسخیر کرنا بے معنی ہو جائے گا۔ اس لئے وہ ایسے محبوب میں چنداں دلچسپی نہ لے گی۔ اس لئے مرد کے لیے عورت سے اس قدر محبت کرنا جس میں اپنا آپ کھو جائے خودکشی کے مترادف ہے۔ عورت سے محبت کرنے میں صرف وہی فرد کامیاب رہتا ہے جو تسخیر ہونے پر آمادہ دکھائی دے لیکن مکمل طور پر تسخیر نہ ہو یا کم از کم ایسا اثر پیدا کر سکے جس سے ظاہر ہو کہ اس کا ایک نہ ایک حصہ ابھی قابل تسخیر ہے۔ ان حالات میں عورت صرف اسی کا ہونا گوارا کرے گی جسے وہ اپنے آپ سے بلند تر سمجھے۔ شاید اسی لئے مرد کی نفسیت ایک ''بھگوڑے'' کی سی ہے۔

بہر حال ایسی صورت میں عورت اور مرد میں صرف دو ممکن تعلقات قائم ہو سکتے ہیں یا تو مرد غالب ہو گا اور زیادہ مغلوب کر دیا

KitaabPoint.blogspot.com

جائے گا۔لیکن یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے عورت کو مغلوب کر لینے کے بعد بھی مرد اس سے محبت کر سکتا ہے۔(بلکہ شاید وہ مغلوب سے زیادہ محبت کرتا ہے)لیکن مغلوب ہونے کے بعد عورت اسے پرانے کھلونے کی طرح پھینک دے گی اور پھر اس میں قطعی طور پر دلچسپی نہ لے سکے گی۔شاید اسی وجہ سے عورت اور محبت میں ایک تباہ کن کشمکش پیدا ہو چکی ہے اور اسی وجہ سے عورت سائے کی طرح ہے تم اس کا پیچھا کرو تو وہ دور بھاگے گی اور تم دور بھاگو تو پیچھے پیچھے آئے گی۔اس ضد کی وجہ سے جو پیچیدگیاں اور لچسپیاں پیدا ہوتی ہیں وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔بہر حال اس کی محبت میں اپنا آپ کھو دینا اپنی شخصیت کے پروں کو جلا دینے کے مترادف ہے۔ایسا فرد ترس کے سوا اس سے کچھ اور حاصل نہیں کر سکتا۔اسی لئے عشاق کو ویرانہ نصیب ہوتا رہا اور مشرقی شاعر شاید عورت سے جان چھڑانے کے لیے کس چالاکی سے ویرانے کے حق میں پرچار کرتے رہے۔

علاوہ ازیں مرد کی غالبیت محض ایک اعتباری حقیقت ہے۔مرد کی ذہنیت ایک سیدھے سادھے دہقان کی سی ہے جسے آپ چودھری کہہ کر جو جی چاہے کروالیں۔اپنی خدمت میں لگا رکھیں تو بھی مضائقہ نہیں۔مرد کو کوئی چودھری کہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اسے چودھری تسلیم کر لیا گیا ہے اسے یہ نہیں سوجھتی کہ آیا اس سے چودھری کا سا سلوک بھی ہو رہا ہے یا نہیں۔عورت نے صدیوں مرد کے ساتھ رہ کر اس کی نفسیت کو پالیا ہے اور وہ چودھری صاحب کو چودھری کہنے میں ذرا تامل نہیں کرتی۔

نظر غائر سے دیکھا جائے تو مساوی حقوق دو مختلف جنسوں کے لیے بذات خود سب سے بڑی بے انصافی ہوگی۔اول تو مساوات میں توازن ممکن ہی نہیں اگر ممکن بھی ہو تو مساوات توازن پیدا نہیں کر سکتی چونکہ توازن صرف ''جس کا کام اسی کو ساجے'' کے اصول پر قائم ہو سکتا ہے۔

عورت کے جسم میں جنسی خواہشات' جنسی اعضا میں مرکوز نہیں جیسے کہ مرد کے جسم میں۔یعنی مرد کی جنسی زندگی روزمرہ زندگی سے مختلف چیز ہے۔اگر مرد کی عام زندگی کو ایک اندھیری سڑک تسلیم کر لیا جائے تو اس کی جنسی آرزو وہ مدھم بتیاں ہوں گی جو یہاں وہاں دور دور چمکنے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن عورت کی جنسی اور روزمرہ زندگی میں فرق نہیں۔عورت میں جنسی پہلو یوں چاروں طرف پھیلا ہوا ہے جیسے صبح صادق کا اجالا یا کسی جدید سینما ہال میں روشنی جہاں بتیاں دکھائی نہیں دیتیں بلکہ منعکس روشنی کا دودھیالہ اسی وجہ سے عورت کی زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب اس کا بیاہ ہو جائے لیکن بیاہ کے بعد مرد کی انفرادیت بلند ہو جاتی ہے اور وہ زیادہ تر ایک کفیل کی حیثیت سے جیتا ہے۔

نہ جانے یہ خیال کیسے عام ہو گیا کہ عورت کے لیے مرد کا اظہار محبت چند مخصوص جسمانی حرکات تک محدود ہے۔اگر یہی بات مرد

KitaabPoint.blogspot.com

کے لئے کہی جائے تو زیادہ موزوں ہوگی۔ اس کے برعکس عورت اس بات کی خواہاں ہے کہ اسے ایسے محبت بھرے ماحول میں رہنے کی خوشی حاصل ہو جس کا تسلسل دوامی ہے۔ اگر چناؤ ممکن ہو تو وہ ہر کسی کی محبوبہ بننے کو تیار نہ ہوگی بلکہ ایسا جیون ساتھی تلاش کرے گی جو مردانہ خصوصیات کا حامل ہو۔ لیکن مشاہدے میں آیا ہے کہ مردانہ سیرت کو مردانہ جسم پر ترجیح دی جاتی ہے اور محبت کی مدھم لو کو طوفانی جذبہ سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اگر اسے اپنے چناؤ یا پسند کا ساتھی نہ ملے تو یا تو وہ خیال کے زور سے اسے ویسا ہی دیکھنا شروع کر دیتی ہیاور یا اپنے خیالی محبوب میں اس قدر کھو جاتی ہے کہ حقیقی ساتھی کو دیکھنے تک کی تکلیف گوارا نہیں کرتی پر کیا مجال ہے جو مرد کو پتہ چل جائے کہ بیوی کے دل میں اس کی حیثیت کیا ہے۔

مرد فاعلی انسان ہے یعنی اس کی زندگی ''کرنا'' کے مترادف ہے۔ اس کی خوشی اسی بات میں ہے کہ وہ کچھ کرتا رہے۔ جدوجہد کرے یا روٹی کمائے یا قوم اور ملک کی خاطر جان گنوانے پر آمادہ ہو جائے۔ جیسے شرابی کی خوشی لڑھک لڑھک کر چلنے، شیخی بھگارنے یا خواہ مخواہ کی باتیں کرنے میں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس عورت مفعول انسان ہے جس میں سہنا پایا جاتا ہے اور سہنا ایک کیفیت ہے جسے کرنے سے کوئی نسبت نہیں۔ اس لئے عورت کیفیتی ہوئی۔ اب غم اور خوشی کو لیجئے۔ غم اور خوشی دو کیفیتیں ہیں جنہیں فعل سے تعلق نہیں اس لئے عورت خوشی اور غم کو حقیقی طور پر جانتی ہے اور مرد مقابلتاً ان سے بیگانہ ہے۔ مرد کے لیے زندگی افراتفری یا ہماہمی کے مترادف ہے۔ درحقیقت مرد کو کچھ کرنے یا سرانجام دینے کے فعل سے دلچسپی ہے تو جب تک وہ کشمکش میں لگا رہے گا اسے اعتبار ہوگا کہ خوشی ہے لیکن عورت میں خوشی کا احساس بالواسطہ نہیں بلکہ مثبت جذبہ ہے۔ وہ خوشی سے یوں لطف اندوز ہونا چاہتی ہے جیسے بکری جگالی کرنے سے۔ اس کے برعکس مرد کو خوش ہونے کا اعتبار ہوا تو معاً بیٹھ رہنا اس کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اٹھ بیٹھا چلو ''پک نک'' پر چلیں۔ کبڈی کھیلیں' سینما دیکھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کسی اور کام میں کھو گئے حتیٰ کہ خوشی کے احساس کی جگہ فعل نے لے لی۔ اب ''غصہ'' لیجئے۔ غصہ ایک فعلی جذبہ ہے جس میں جی چاہتا ہے کہ کچھ توڑ پھوڑ دیں۔ کوٹھے سے کود پڑیں یا چینی کی طشتری اٹھا کر دیوار سے دے ماریں۔ یہ خالص مردانہ جذبہ ہوا جسے عورت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں انتقام ایک مسلسل کیفیت کا نتیجہ ہو سکتا ہے اس لئے اس کی اہلیت عورت میں زیادہ ہے۔ اگرچہ عام طور پر وہ بخش دیتی ہے۔ جنسی تعلقات میں مرد کی خوشی صرف ولولے تک محدود ہے یا ایک قسم کی وحشت تک اور وہ بھی صرف اسی وقت تک رہتی ہے جب تک کہ تموج کی کیفیت ہے۔ لیکن عورت کے دل میں خوشی کی مدوجزر لہروں کی طرح مدھم اور دوامی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مرد کو جنسی تعلقات میں اس لئے خوشی ہوتی ہے چونکہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ عورت پر غالب ہے یا اس کی خوشی کا باعث ہو رہا ہے اور بس۔

KitaabPoint.blogspot.com

جہاں تک جینے کو جذبات سے تعلق ہے عورت جیتی ہے اور زندگی کی ہر کون کو ایک مادی چیز کی طرح محسوس کرتی ہے جہاں تک جینے کو کرنے سے تعلق ہے مرد جیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کیفیتی لطف میں دوام ہے۔ شاید جبھی مہاتما بدھ نے نروان کی عظمت اور خوشی کو محسوس کیا نہ جانے مہاتما جی میں کس حد تک عورت جی رہی تھی ورنہ ایک خالص مرد کا بعید از قیاس انکشاف کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

جغرافیائی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو استوائی مرد اہل مغرب کے مقابلہ میں زیادہ کیفیتی ہیں اور اہل مغرب مقابلتاً زیادہ فعلی۔ استوائی علاقوں میں اس تگ و دو کو تصور میں بھی نہیں لایا جا سکتا جو یورپ میں ہر سے پیش پیش رہتی ہے۔ چونکہ ان علاقوں میں نباتاتی افراط دیکھ کر یوں احساس ہوتا ہے جیسے قدرت آپ ہی آ کر آٹا گوندھ کر روٹی پکا کر چنگیر میں رکھ جائیگی۔ شاید اسی لئے تقدیر کا مسئلہ استوائی علاقوں پر حاوی ہے۔ لیکن اہل مغرب تقدیر پر شاکر رہ کر بھوکوں مرنے سے گھبراتے ہیں نروان کا مسئلہ استوائی علاقوں میں ظاہر ہو سکتا تھا۔ ٹھنڈے ممالک میں نہیں۔ چونکہ ان علاقوں میں نباتات کو کھڑے پھلتے پھولتے دیکھ کر معاصروان کی سوجھتی ہے۔

بہر حال مرد فعلی انسان ہے اور اس کی زندگی ایک جذبہ کے ماتحت نہیں گزر سکتی اس کے نزدیک جذبہ کیفیت نہیں بلکہ ایک ایسی عملی تحریک ہے جو اسے اٹھا کر بٹھا دے اور کچھ نہ کچھ کرنے پر مائل کر دے۔ اسی لئے اسے تغیر پسند ہے اور وہ ہرجائی ہے اور متلون مزاج بھی۔ اس کے لیے زندگی جلنا ہے یا جلنا بجھنا اور پھر جل جانا تاکہ جلنے کا امکان رہے۔ لیکن عورت ایک جذبہ کے ماتحت جی سکتی ہے وہ بیٹھے بیٹھے جی سکتی ہے اور جینے کی کیفیت پر حاوی ہے۔ اس کے نزدیک خوشی اور غم سردی گرمی کی سی مثبت اور مخصوص کیفیتیں ہیں جنہیں وہ یوں محسوس کر سکتی ہے جیسے بلی پر ہاتھ پھیر کر نرمی محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ سلگنا جانتی ہے جلنا نہیں۔ البتہ وہ جل جانے کو بجھنے پر ترجیح دے گی۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

باپ

کسی شخص پر عظمت تھوپ دیجئے اور اسے ممنوع قرار دیکر علیحدہ کسی بلند جگہ پر بٹھا دیجئے تو اس میں باپ کی سی جھلک پیدا ہو جائے گی۔ باپ کو بچے پیدا کرنے سے تعلق نہیں بلکہ وہ ایک مخصوص نفسی کیفیت کا نام ہے۔ اگر کسی مرد کے گھر بچہ پیدا ہو جائے یا وہ واقعی بچہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے تو یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ باپ بن گیا ہے جس طرح لوہے کی الماری اور ساہوکار کے درمیان ابھری ہوئی توند نہ ہو جس پر ہاتھ پھیرا جا سکے تو مہاجنی نفسیت قائم نہیں رہ سکتی اسی طرح مصنوعی عظمت علیحدگی اور ''خبردار'' کی جھلک کے بغیر پدرانہ نفسیات ممکن نہیں۔

کسی بچے کے دل میں جھانک کر دیکھنے سے واضح ہوگا کہ باپ ایک قوی ہیکل مرد ہے جو دور بیٹھا رہے اور اس کے باوجود سب کچھ جانتا ہو۔ جس سے اماں ڈرتی رہے۔ جس کے پاس بہت سے پیسے ہوں۔ جس کے متعلق یقین سے نہ کہا جا سکے کہ کب مسکرائے گا اور کب گھورنا شروع کر دے گا جسے زندگی کی دلچسپ ترین باتوں سے کوئی لگاؤ نہ ہو جس کی طبیعت ناساز ہو تو بچوں پر لازم کر دیا جائے کہ کھیلنا کودنا چھوڑ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہیں۔ یا اشاروں کی مدد سے باتیں کریں یا چپ چاپ بیٹھے سوچتے رہیں کہ بلی کی دم کھینچی جائے یا آپا کی چٹیا اور جس کی طبیعت اکثر ناساز رہے۔

ہم نے اپنے دل میں خدا کے متعلق جو تصویر پیدا کر رکھی ہے وہ کسی بڑی فیکٹری کے مینیجر کی سی نہیں جو ادھر ادھر گھومتا ہے۔ ملازمین سے بلا تکلف ملتا ہے۔ حالات کا مطالعہ کرتا ہے اور کبھی کبھار سیٹی بجانے سے بھی گریز نہیں کرتا بلکہ وہ کسی بڑے خزانچی سے ملتی جلتی ہے جو لوہے کی سلاخوں کے پیچھے لوہے کے ہیبت ناک صندوق کے سامنے مسند پر بیٹھا رہتا ہے۔ بچوں کے دل میں باپ کی تصویر بھی ایسی ہی ہے جسے گھر چلانے کے لیے چلنا پھرنا نہیں پڑتا جو دور بیٹھ کر کن کہہ دیتا ہے۔ اور معاً گھر گھڑی کی طرح ٹک ٹک کرنا شروع کر دیتا ہے۔ گھر میں فساد کا اندیشہ ہوا تو ایک گہری اور واضح آ ہم....... جو پیٹ کے نچلے پردوں سے نکلتی ہوئی سنائی دیتی ہے اور یا....... حمید!!!....... بس سارے کام خود بخود سنور جاتے ہیں۔ ایک سناٹا چھا جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے صور اسرافیل کے بعد سجدے میں گر کر سارا گھر مومن ہو گیا ہو۔

باپ بننے کے لیے لازم ہے کہ کم از کم ایک اپنی بیوی ہو جسے اعلانیہ طور پر اپنایا جا سکے اور جس کے بچے بھی ہوں۔ اس میں براہ

KitaabPoint.blogspot.com

راست تولید کی کوئی اہمیت نہیں۔ بعض ایسے مرد بھی ہیں جنہیں کبھی شبہ تک نہیں ہوا کہ وہ کسی کے باپ ہیں اور اس غلط فہمی یا خوش فہمی کی وجہ سے وہ اعلانیہ ہنسنے کھیلنے یا رونے سے کبھی گریز نہیں کرتے اور ایسے مرد بھی ہیں جو لطیف اور انسانیت بھری حرکات کو اپنے آپ پر اس لیے حرام کر چکے ہیں کہ وہ باپ ہیں۔ چونکہ ان کی بیویاں انہیں حمید کا ابا یا سعید کا میاں کہتی ہیں اور لوگ خود کو حمید یا سعید کا ابا سمجھتے ہیں۔

بہر صورت باپ بننے کے لیے لازم ہے کہ بیوی حمید کا ابا کہہ کر بلائے' لوگ حمید کا ابا سمجھیں اور بالآخر وہ خود اپنے آپ کو حمید کا ابا تسلیم کر لے۔ یعنی بیوی کا کہنا' لوگوں کا سمجھنا اور اپنا ایمان اور احساس ان تین لوازم کے بغیر پدری نفسیات کی تشکیل نہیں ہوتی۔

قدرت باپ پیدا نہیں کرتی بلکہ صرف بچے پیدا کرتی ہے باپ بننے کے لیے خود بچے پیدا کرنا ضروری نہیں۔ البتہ بچے ہونے ضرور چاہئیں۔ اور باپ بن جانے پر ہمیں کسی ایسے خصوصی برتاؤ یا انداز کا پابند ہونا نہیں پڑتا جیسے بلی چوہے کو دیکھ کر اسے مار دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ بحیثیت رشتہ سماجی نظام کا ایک اعزازی مرتبہ ہے جیسے ذات پات میں براہمن یا جمہوریت میں پریذیڈنٹ جو ہمارے بزرگوں نے ایجاد کیا تھا اور جس نظام کو خاندان پدر پسری کہتے ہیں۔

سنا ہے بہت پرانے زمانے میں باپ کبھی کبھار آتا تھا اور وہ بھی چوری چوری حتیٰ کہ اس کے بچوں کو بھی پتہ نہ ہوتا کہ وہ ان کا باپ ہے یا وہ کوئی ہے بھی یا نہیں۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب وہ مسلسل دو تین سال کی غیر حاضری کے بعد گھر آتا اور لوگ اسے تازہ بیٹے کی پیدائش پر مبارکباد دیتے تو بیچارہ پھولا نہ سماتا اور اس عنایت پر دیوتاؤں کو نوتا چونکہ اس زمانے میں اولاد دیوتاؤں کی دین سمجھی جاتی تھی۔ (تعجب ہے دیویوں کی دین کیوں نہ سمجھی جاتی تھی) پھر کسی دیوی نے دیوتاؤں کی دین کا راز کھول دیا۔ نہ جانے غلط فہمی یا خوش فہمی کے زیر اثر۔ اور مردوں نے وقت کی نزاکت کو سمجھ کر خاندان پدر پسری کی بنیاد رکھ دی اور اعلان کر دیا کہ آئندہ سے کوئی خاوند گھر کی بیلی نہ ہانکے گا جب تک اس کے بیٹے اس کے اپنے بیٹے نہ ہوں اور کوئی کسی عورت کو بیوی بنانے کو تیار نہ ہوگا جب تک وہ نیک بخت مطلقاً باعصمت نہ ہو۔ اس معمولی سے انکشاف پر اک افراتفری پیدا ہو گئی۔ عصمت کی حفاظت کے لیے آہنی پیٹیاں وضع کی گئیں تالے لگانے میں احتیاط برتنا لازم ہو گیا۔ کنواریوں کے جسم کانٹوں سے سی دیئے گئے۔ دولہا میاں پر تلوار کا دھنی ہونا عائد کر دیا گیا اور نہ جانے گاؤں کے لوہار کو جھک جھک کر سلام ہونے شروع ہوئے یا نہیں۔ یعنی مختصر یہ کہ سوسائٹی کو آبخورے میں ڈال کر یوں ہلا دیا گیا جیسے امرودوں کو نمک لگا کر بیچتے ہیں۔ بیچاری بیویوں پر اک قیامت ٹوٹ پڑی' ان پر وفا عائد ہو گئی....... اس پر بیویوں اور دھرتنوں کو سوجھی کہ خاوند کا نام لینا ان کے شایان شان نہیں اس بنا پر وہ انہیں حمید کا ابا یا کرشن کا پتا کہہ کر بلانے لگیں اور بار

KitaabPoint.blogspot.com

بار د ہرا کر میاں کو اپنے بیٹے کا باپ ہونے کا اور ضمنی طور پر اپنی وفا کا یقین دلانے لگیں۔ لوگوں نے سنا اور اسے حمید کا ابا سمجھنا شروع کر دیا اور آخر کار بار بار سن کر میاں نے حمید کا ابا ہونا تسلیم کر لیا اور نفسیات پدری کی تشکیل ہونا شروع ہو گئی۔

اس حادثے پر عورتوں کو فکر دامنگیر ہوئی کہ اگر مرد نے ایک اعتباری وصف یعنی وفا کو جیتی جاگتی عورت پر ترجیح دینا شروع کر دیا تو...... اس طرح شاید ہو بیوی رکھنے سے بھی منکر ہو جائے۔ یا رکھ بھی لے تو بچے پیدا کرنے کی صورت حالات ہی کو ترک کر دے۔ معاملہ پیچیدہ ہونے کے علاوہ خطرناک بھی تھا۔ یعنی بلی کے گلے میں گھنٹی ڈالنے والی بات تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ بلی میاؤں ہے اور بس۔

پوری تواریخ سے تو مجھے واقفیت نہیں البتہ سننے میں آیا ہے کہ جلد ہی یہ خیال عام ہو گیا کہ مرد وہ ہے جس کا بیاہ ہو چکا ہو یعنی صرف بیاہ ہو جانے کے بعد کوئی یقینی مرد سمجھا جا سکتا ہے اور بچے ہو جانے کے بعد معقول اور معزز مرد۔ حالانکہ بیوی یا بچوں کے ہونے سے مرد کو قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ اس معمولی سی بات نے مرد کو مشکل میں ڈال دیا کیونکہ اس کا مرد ہونے یا نہ ہونے کا تمام تر انحصار دلہن کے سر کی ہلکی سی جنبش پر موقوف ہو گیا۔ یعنی وہ ہلکی سی جنبش مرد کے لیے ''کن'' کی سی ہو گئی اس کا تمام تر وقار اس موہوم سی جنبش پر منحصر ہو گیا۔

اگرچہ بیوی کے حق میں ''باعصمت'' کا فیصلہ کرنا مرد کے اختیار میں تھا مگر مرد کو پورے طور پر احساس تھا کہ اس کا تمام تر وقار دلہن کے اشارے پر منحصر ہے اس کے بعد مرد کے لیے مشکل ہو گیا کہ وہ عروسی تعلقات کے بعد سفید چادر کو آلودہ نہ پائے یا کانٹوں کی سلائی کو مضبوط نہ پائے اس کے علاوہ اس معمولی سی بات کا اثر یہ بھی ہوا کہ شادی نہ کرنا یا بچے پیدا کرنے کی صورت حالات سے اجتناب کرنا مرد کے لیے مشکل ہو گیا۔ چونکہ مرد سب کچھ کھونا گوارا کر سکتا ہے مگر ''مردپنا'' کھونا تو کیا اسے کھویا ہوا سمجھا جانا بھی اسے گوارا نہیں۔

باقی رہا بچوں کا مسئلہ اس بیچارے کو یہ فکر ہوتی ہے کہ ہو جائیں چاہے دکھانے کے ہوں تاکہ لوگوں میں معزز اور معقول تو سمجھا جائے اور پھر اپنی نظر میں بھی معقول دکھائی دے تو کیا حرج ہے۔ لہٰذا بچوں کو اپنی شکل پر دیکھے تو کیا مضائقہ ہے۔ چنگاری تو پیدا ہو گئی اب پنکھا کرنا کیا مشکل تھا۔ دیکھو نا بالکل اپنے بابا پر گیا ہے۔ بس وہی عادت وہی طبیعت' میں کہتی ہوں انہیں چھپاؤ اور اسے دکھاؤ۔ کوئی فرق بھی ہو۔ اب کوئی کب تک سنی کو ان سنی کرتا رہے اور پھر وہ بات جو مکمل 'معقول اور معزز کے مراتب پیش کر رہی ہو۔

آج کل بھی تو ہمیں شادی سے پہلے مشکوک مرد سمجھا جاتا ہے۔ یقین نہ آئے تو کسی محلے میں کرایہ پر مکان لینے چلے جائیں

KitaabPoint.blogspot.com

یا دیر تک کنوارہ رہ کر دیکھ لیجئے کہ لوگ آپ کو کن نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ گویا آپ کا نام دس نمبرک رجسٹر میں درج ہے۔ بیاہ ہو جانے پر یہ شکوک شبہات یوں اڑ جاتے ہیں جیسے سورج نکل آنے پر اوس کے قطرے۔

ہر رائے عامہ کسی نہ کسی مقصد کو لئے ہوتی ہے اور اس کے رائج ہونے میں جس کا مفاد ہو وہی اس کا موجد ہو سکتا ہے یا جس کے لیے وہ باعث راحت یا دافع کلفت ہو اگر مرد کا معقول اور معزز ہونا اس امر پر مبنی ہے کہ وہ گھر میں ایک بیوی لے آئے تو عظمت کس کی ہوئی۔ آپ کہیں گے کہ یہ تو مرد کی رائے ہے۔ شادی شدہ مرد صرف وہ ہوتے ہیں جن کے گھروں میں بیویاں ہوں اور اس چھوٹی سی تفصیل کو بھولنے سے بہت فرق پڑ جاتا ہے۔

اگر چہ باپ کو براہ راست تولید سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اس کے دل میں اس احساس کا ہونا لازمی ہے کہ وہ حمید کا ابا ہے چونکہ یہی احساس یا پیمانخاندان پدر پسری کا پائے ستون ہے جس کے اوپر یہ عالیشان ایوان صدیوں سے کھڑا ہے۔ لیکن پائے ستون ہونے کے باوجود یہ ایمان یا احساس برتاؤ کی وہ تفصیلات پیدا نہیں کر سکتا جو ''باپ'' کا ٹریڈ مارک بن چکی ہیں۔ پھر باپ کو کیسے معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اسے یوں کھنکارنا چاہیے یا امن قائم کرنے کے لیے اس آواز میں حمید!....... کہنا چاہیے یا دور بیٹھے نظر آنا چاہیے یا زندگی کی چھوٹی چھوٹی دلچسپ حرکات یا چیزوں سے اکتائے ہوئے دکھائی دینا چاہیے۔ بچوں کے دل میں باپ کی جو تصویر بن جاتی ہے اس میں کون رنگ بھرتا ہے کہ ایک سادہ سا معصوم لفظ ''ابا'' یا باپ ان کے لیے مفہوم سے لد جاتا ہے۔

یہ کہنا کہ بچے اس تصویر کے موجد آپ ہوتے ہیں قرین قیاس نہیں۔ بچے تو دادا سے معزز اور بزرگ شخص کی داڑھی سے کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ابتدائی جھینپ کے بعد وہ آپ کو ہاتھ سے پکڑ کر یوں گھسیٹنا شروع کر دیں گے جیسے آپ بکری ہوں اور آپ کا ہاتھ گلے کا رسہ جو بوڑھے فقیر کو پتھر مارنے سے گریز نہیں کرتے اور کوڑھی کو بھی تماشا بنا لیتے ہیں۔ بچوں کا بس چلے تو وہ ابا کو گلی ڈنڈا کھلائیں اسے سمجھائیں کہ مانی کا مرغا کیسی عجیب عجیب حرکات کرنے کا عادی ہے۔ ان کا بس چلے تو وہ باپ کو سرکس کا جو کر بنا دیں۔

بچوں سے باپ کا تعلق تو محض اعتباری ہے کیونکہ انہیں براہ راست ماں سے تعلق ہوتا ہے باپ سے نہیں۔ ادھر باپ کو براہ راست بچوں کی ماں سے تعلق ہوتا ہے۔ بچوں سے نہیں۔ یعنی ماں ایک ایسا فیوز ہے جو بلب اور بجلی کو آپس میں جوڑتا ہے تاکہ بلب روشن رہے لیکن اگر رو تیز ہو جائے تو بلب کے تحفظ کے لیے رو کو کاٹ بھی دیا جاتا ہے۔ بہر صورت باپ اور بچوں کے درمیان ماں کھڑی رہتی ہے اور دونوں میں تعلق پیدا کرنا یا اس تعلق میں رنگ بھرنا ماں پر منحصر ہے۔ کیونکہ اسے دونوں سے براہ راست تعلق ہوا۔

KitaabPoint.blogspot.com

ظاہر ہے کہ بچوں کے دل میں باپ کی تصویر وہی پیدا کرتی ہے اور باپ کے دل میں بچوں کے متعلقہ فرائض کا احساس اور ان کی نوعیت وہی قائم کرتی ہے یعنی نفسیات پدری ماں کی شوخیٔ تحریر ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ نفسیات پدری کی شکل ایسی کیوں ہے جیسی کہ اس نے صدیوں سے قائم کر رکھی ہے اور اسے ایسی شکل دینے میں ماں کا مقصد کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ماں کے دو مقصد ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ باپ بچوں کو بغیر شک وشبہ اپنائے' یعنی انہیں ضروریات زندگی بہم پہنچائے بلکہ ان کے لیے اپنی زندگی بھی حرام کر لے تو کوئی مضائقہ نہیں اور ان کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو تیار ہو جائے کہ اپنے بچے پرورش پا سکیں ل یکن اس کے باوجود وہ یہ نہیں چاہتی کہ بچے باپ کو اس قدر اپنا لیں کہ وہ خود نظرانداز ہو جائے۔ اس کے برعکس وہ چاہتی ہے کہ اس ے بچے براہ راست ماں سے محبت کریں تو لازم ہوا کہ بچے باپ سے دور رہیں۔ یعنی اس سے ڈریں چونکہ جس قدر وہ باپ سے ڈریں گے اور دور رہیں گے اسی قدر ماں سے قریب تر ہو جائیں گے یہ اس کا دوسرا مقصد ہوا۔

نہ جانے مرد میں یہ عادت کیسے پیدا ہوئی کہ وہ اپنے متعلق رائے قائم نہیں کر سکتا۔ اس بارے میں وہ لوگوں کی رائے سننے کا محتاج ہے یعنی اگر حمید کا ابا لوگوں سے سن پائے کہ وہ نہایت معقول بات کا پکا اور متحمل مزاج آدمی ہے تو وہ بیچارا اپنے آپ پر لازم کر لیتا ہے کہ ایسا ہی دکھائی دے جیسے کہ لوگ اسے سمجھتے ہیں۔ چاہے یہ اوصاف یا ان کا پرتو پیدا کرنے کے لیے اسے زندگی کی لطافتوں کو اپنے آپ پر حرام ہی کرنا پڑے۔ یقین نہ ہو تو کسی عام مرد سے کہہ کر دیکھ لیجیے۔ "چودھری صاحب!! اجی چودھری صاحب تو وہ شخص ہیں کہ جب تک کسی کو دسترخوان پر نہ بٹھا لیں کھانا تک نہیں کھا سکتے" اگر چودھری صاحب ذرا سخت طبیعت کے واقع ہوئے ہیں تو آپ کو یا سے فقرے چند ایک بار دہرانے پڑیں گے۔ بہرحال جلد ہی چودھری صاحب کا دسترخوان ہو گا اور آپ۔ میری بات جھٹلانے کی خاطر کہیں لالہ جی کو تختۂ مشق نہ بنا لیجیے گا۔ چونکہ میں مردوں کے متعلق بات کر رہا ہوں روپے پیدا کرنے والی مشینوں کے متعلق نہیں۔ اکثر خاوند اپنی ازدواجی زندگی میں صرف اس لئے خوش ہیں کہ لوگ انہیں خوش سمجھتے ہیں۔ عورت کے لیے خوشی قطعی پرائیویٹ احساس ہو تو ہو مرد کے لیے ایسا نہیں بیوی خاوند کے اس راز کو جانتی ہے۔

نہ جانے کس نے کہا تھا کہ بیوی اس بھید کو جانتی ہے کہ میاں اپنی آرائشی اور اعتباری عظمت اور ظاہری برتری کے باوجود درحقیقت ایک بچہ ہیں اور ہر بیوی کو اس راز سے واقف ہونے کی ضرورت ہے کہ وہ خاوند پر یہ ظاہر کرے کہ وہ اسے ایک برتر اور زبردست ہستی سمجھتی ہے۔ عورت کی فطری مگر خارجی خصوصیت "زبردستی" بذات خود مرد کو یہ احساس دینے میں بہت مفید ہے یعنی اسے

KitaabPoint.blogspot.com

اس راز کو جاننے کی مصیبت سے بھی چھٹکارا ہوا۔

ان حالات میں باپ اپنے متعلق رائے قائم نہیں کر سکتا۔ یعنی وہ خود نہیں جان سکتا کہ باپ کو کیا روپ دھارنا چاہیے اور بچوں کے روبرو کس شکل میں پیش ہونا چاہیے تو ظاہر ہے کہ باپ کے متعلق مرد کے خیالات بیوی یا ماں کے بنانے سے ہی بنتے ہیں باپ اس ایکٹر کی طرح سٹیج پر نکل آتا ہے جسے اپنا پارٹ یاد نہ ہو اور ماں پس پردہ ''پرامٹ'' دیتی رہتی ہے۔

مرد کو لوگ جس قدر سمجھیں گے اس پر عائد ہو جائے گا کہ وہ اسی قدر معقول نظر آئے۔ یعنی اس کی خواہشات کا وہ حصہ جو لوگوں کی نگاہ میں معقولیت سے خارج ہے اس کے دل میں دبا رہے گا اور اس کا اظہار کھلے بندوں نہ ہو سکے گا۔ لیکن اظہار کے بغیر چارہ بھی ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ غیر معقول حصہ اظہار کے لیے تخلیہ کا منتظر رہے گا اور تخلیہ صرف بیوی کے روبرو زیادہ معقول مرد یا خالص باپ بنتا جائے گا توں توں بیوی کے روبرو غیر معقول یعنی بچہ بنتا جائے گا اور بچے کو کھیل سے دلچسپی ہوتی ہے لہٰذا وہ روز بروز کھیل میں مصروف ہوتا جائے گا۔

اور بیوی کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ اس سے کھیلا جائے وہ اس بھید سے واقف ہے کہ کھلونا دل بہلاوا سہی مگر بچے کے لیے اس کی عظمت لاریب ہے نٹشے کا قول ہے بتحقیق مرد خطرہ اور کھیل کا شوقین ہے جبھی وہ عورت سے پیار کرتا ہے جو ایک خطرناک کھلونا ہے۔ خطرناک اس لئے کہ عورت جان بوجھ کر کھلونا بن جاتی ہے جو کسی کو بہلانے کے لیے جان بوجھ کر کھلونا بننے سے بھی گریز نہ کرے وہ کھلونا ہوا یا کھلاڑی؟

چھٹپنے میں ہمارا بچپن محض سطحی ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ اس کا نفوذ ہوتا رہتا ہے اس لئے وہ اکٹھا ہونے نہیں پاتا پھر معقولیت کے دور میں ہم اسے باطن میں سلب کر کے چھپا لیتے ہیں۔ اظہار بچپن پر بندشیں ڈالنے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ باطن میں اکٹھا ہوتے ہوتے ایک طوفان بن جاتا ہے اور کسی دن بند توڑ کر باہر نکل آتا ہے۔ جبھی تو بڑھاپے میں ہم مکمل طور پر بچہ بن جاتے ہیں۔ کئی اصحاب کا خیال ہے کہ انسان میں بچپن نہ ہو تو وہ درندہ رہ جائے....... شاید یہ بھی حقیقت ہو کہ بچپن کی ہلکی ہلکی برباس رنگینی پیدا کرتی ہے مگر اس کا سیلاب دیوانگی۔

نفسیات پدری میں رنگ بھرنے کی تفصیلات بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

با آواز بلند ماں اپنے بیٹے حمید کو غصے میں کہتی ہے ''حمید....... ایسی گندی باتیں کرتے ہو تم؟ اگر انہوں نے سن لیا تو۔ اندر بیٹھے ہیں تمہارے ابا....... حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ حمید کا ابا حمید کی بات سن چکے ہیں اور اس کی اپنی بات بھی سن رہے ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

لیکن وہ حمید سے یوں بات کرتی ہے گویا پرائیویٹ مشورہ دے رہی ہے۔ حمید سمجھتا ہے کہ گندی بات کرنا برا نہیں بشرطیکہ ابا نہ سنیں۔ ادھر باپ سمجھتا ہے چلو گھورنے اور جھڑکنے کے بغیر ہی بچے سدھر رہے ہیں۔ اور گھر میں باپ کی فوقیت ختم ہو رہی ہے اس کے علاوہ اس کے دل میں ایک خاموش اصول قائم ہو رہا ہے کہ باپ گھر میں ہو تو بچوں کو ایسی ویسی باتیں نہ کہنی چاہئیں۔

ماں کہتی ہے "حمید میں پوچھتی ہوں' تو شور مچانے سے باز نہ آئے گا۔ معلوم نہیں تجھے وہ اندر بیٹھے کام کر رہے ہیں۔ باپ سمجھتا ہے ہوں جب باپ کام کر رہا ہو تو بچوں کو چاہیے کہ چپ چاپ بیٹھے رہیں۔ ذرا شور نہ مچائیں۔ پھر وہ چونک کر سوچتا ہے "ہائیں' میں تو تقریباً ناول پڑھ رہا ہوں....... کام!....... حتیٰ کہ وہ جان لیتا ہے کہ باپ چاہے کچھ ہی کر رہا ہو وہ ایک اہم اور ضروری کام ہوتا ہے۔

بچے سوچتے ہیں ابا عجیب انسان ہے جس کی موجودگی میں ہنسنا' کھیلنا شور بن جاتا ہے اور سیدھی سادی باتیں گندی سمجھی جاتی ہیں اور امی کیسی اچھی ہے جو نہ ہنسی کھیل سے گھبراتی ہے اور نہ کسی بات سے بچے دل میں یہ سمجھ لیتے ہیں کہ گندی باتیں اور شور و غل بذات خود بری نہیں لیکن اگر ابا موجود ہوں تو ایسی حرکات بری ہو جاتی ہیں۔ یعنی ابا کا وجود ہی ان کے لیے باعث قدغن ہو جاتا ہے۔

پھر ماں کہتی ہے "حمید" تم پھر ضد کر رہے ہو' کہوں میں تمہارے ابا سے ان سے پٹے بغیر تمہیں بھی چین نہیں آتا۔

باپ سنتا ہے اچھا بچہ ضد کرے تو مجھے پیٹنا چاہیے یعنی میری موجودگی میں ضد کرے تو میری توہین ہے۔ ادھر بچہ سنتا ہے کیسی پیاری امی ہیں باپ کے پیٹنے سے برا مانتی ہیں۔

ماں کہتی ہے لڑکا کا کہیں کا۔ آپا کو مارتا رہتا ہے۔ اچھا تمہارے ابا آلیں تو انہیں بتاؤں گی کہ ہر وقت فریدہ سے دنگا کرتا رہتا ہے۔ (اندر باپ سنتا ہے اور اپنی موجودگی کا اظہار کرنے کے لیے کھانستا ہے) فریدہ ماں سے کہتی ہے۔ "اماں ابا تو اندر بیٹھے کام کر رہے ہیں' حمید کا دم خشک ہو جاتا ہے فریدہ ماں کو خاموش دیکھ کر کہتی ہے "پھر مجھے مارو گے کہوں ابا سے دبی آواز سے' اسے دھمکاتی ہے' ا....... با....... جی....... اور فاتحانہ طور پر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتی ہے۔ اتنے میں ماں بول اٹھتی ہے "فریدہ شور نہ مچاؤ آخر بچہ ہے۔ تم بھی تو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتی ہو"

حمید کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں "جب تک امی ہے ابا ہوں بھی تو کیا ہے ہوا کریں" اور وہ ماں کے قریب تر جا بیٹھتا ہے۔ باپ کے کھانسنے کی آواز پھر آتی ہے' اس مرتبہ وہ اپنی کھنکار میں رعونت پیدا کر لیتے ہیں چونکہ انہیں معلوم ہے کہ باورچی خانہ میں حالات بگڑ رہے ہیں مگر حمید اس رعونت بھری کھنکار کی پروا نہیں کرتا۔ "امی جو ہے ابا ہیں بھی تو ہوا کریں۔ جب تک ماں اس آواز کو مفہوم نہ بخشے باپ کی کھنکار ایک بے معنی آواز ہے۔ یہ ماں کی اپنی مرضی ہے کہ اسے جیسا مفہوم جی چاہے بخش دے۔ نہ تو بچوں کو یہ معلوم ہے

KitaabPoint.blogspot.com

کہ ماں ہی "باپ" کے لفظ میں رنگ بھر رہی ہے اور نہ باپ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ماں اس کو باپ بننا سکھا رہی ہے۔ باپ روز بروز بچوں کے لیے ایک ناقابل برداشت رکاوٹ بنتا جاتا ہے۔ اور اپنے متعلق رائے سن سن کر اپنے آپ کو اس کے مطابق وضع کرتا رہتا ہے اسے صرف یہ احساس ہوتا ہے کہ بچوں کے سامنے معزز اور بارعب ہستی نظر آنا چاہیے مگر وہ نہیں جانتا کہ اس رعب کے ذریعے جو ماں اسے دے رہی ہے اس پر عظمت' علیحدگی اور بلندی تھوپی جا رہی ہے اور بچے دل ہی دل میں اس سے نفرت کر رہے ہیں۔

تو ماں کی دبی دبی آوازیں جو باورچی خانہ سے اٹھتی ہیں باپ کے دل میں اتر کر اس کے ماتھے پر گھوریاں' خدوخال میں جمود کھنکار میں رعونت اور طبیعت میں عظمت اور برتری بن جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی اور دنیا کا فرد ہو۔ جہاں لوگ لوہے سے بنے ہوتے ہوں۔ گھر میں وہ قدم نہیں رکھتا جب تک وہ اس خصوصیات کو چہرے اور انداز پر نمایاں نہ کر لے حتیٰ کہ یہ گھر بہروپ باپ پر اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ وہ باہر دکان پر یا دفتر میں بھی باپ ہی بنا رہتا ہے۔

ایسی چھوٹی چھوٹی دو دھاری باتوں سے ادھر تو میاں پر معقول برتاؤ واضح کر کے ادھر بچوں کے دل میں یہ تخیل پیدا کر کے کہ باپ کس بلا کا نام ہے اور باپ اور ماں میں کیا فرق ہے ماں اپنے دونوں مقصد حاصل کر رہی ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ جب کبھی باپ بچوں کو سرزنش کرے جس پر باپ کو اس نے بذات خود مائل کیا تھا تو ماں جھٹ کر کہتی ہے "آپ جانے بھی دیں' ابھی بچہ ہے بڑا ہو کر خود ہی سمجھ جائے گا" بچہ سوچتا ہے دیکھا امی کتنی سمجھدار ہے اور بابا بیچارے کو یہ بھی پتہ نہیں کہ ہم بچے ہیں اور وقت آنے پر سب کچھ سمجھ لیں گے۔ پھر دل ہی دل میں اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ بچہ بنے رہنے میں بہت فائدہ ہے اس لئے وہ بچہ بنا رہنے کی کوشش کرتا ہے۔

اگر خاوند کے سامنے ان کی ماں سے پیار' محبت کی بات کہہ دے تو بیوی مسکرا کر کہتی ہے "یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ لڑکی اب جوان ہے۔ بچے اب کوئی بچے نہیں جوان ہو چکے ہیں۔ وہ کیا کہیں گے؟" یعنی چاہے اسے پیار سے محروم ہی ہونا پڑے وہ یہ گوارا نہیں کرتی کہ باپ کے متعلق جو تخیل اس نے بچوں کے دل میں اتنی محنت سے پیدا کر رکھا ہے وہ برباد ہو جائے بچے یہ نہ سمجھ لیں کہ باپ میں بھی انسانیت کا عنصر ہوتا ہے۔

ماں کی ان چھوٹی چھوٹی مگر ہمہ گیر باتوں کا یہ اثر ہوتا ہے کہ باپ تو خالص باپ بن جاتا ہے اور بچے بچے ہی رہتے ہیں اور ماں کے دونوں مقصد پورے ہو جاتے ہیں۔

بچہ جب تک رہے گا اسے اپنے انفرادی وجود کا احساس نہ ہوگا۔ وہ اپنے آپ کو ماں کا ایک جزو سمجھے گا۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے

KitaabPoint.blogspot.com

بیل کی طرح ماں کا سہارا بنے گا۔ یعنی ماں سے محبت کرے گا تو ماں بچے کو حاصل کرنے کی غرض سے اس میں بے بسی پیدا کرنے اور اسے برقرار رکھنے سے بھی گریز نہیں کرتی۔

ادھر باپ بیٹے کو بچہ سمجھ کر خوش ہوگا چونکہ اس کے خیال کے مطابق بیٹا اس کی اپنی تخلیق ہے۔ اس کے جسم کا ایک حصہ ہے اور حصہ تمام سے کمتر چیز ہوئی۔ کیسا خوش کن خیال ہے۔

ہر باپ کے دل میں یہ خفیہ احساس قائم ہے کہ سب سے نااہل شخص اس کا اپنا بیٹا ہے چاہے وہ عمر میں کتنا بڑا کیوں نہ ہو آخر حصہ ہے اور کل کل۔ ویسے دنیا کے سامنے اپنی مخلوق پر ناز کرنا علیحدہ بات ہے۔ اس لئے کہ باپ اس کے بیٹے کو اپنائے ماں کہتی ہے ''آخر باپ کا بیٹا جو ہوا باپ ہی کا نام ہوگا اور باپ اس خیال پر کہ اس کا نام ہوگا بیٹے کے لیے محنت کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔

بیٹا جب بڑا ہو جائے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ''باپ'' ایسا نہیں جیسا کہ وہ اسے سمجھتا رہا۔ مگر وہ یہ نہیں سوچتا کہ باپ نے تو کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ میں ایسا ہوں اور باپ کا تخیل جو اس کے دل میں تھا وہ تو ماں کی شوخئ تحریر تھی۔ مگر اس احساس پر کہ وہ دھوکے میں رکھا گیا وہ باپ سے بگڑ جاتا ہے اور باپ بیٹے کے اختلاف شروع ہو جاتے ہیں اور بیچارے باپ کی عمر کا آخری حصہ بیٹوں کی بغاوت سے زہر آلود ہو جاتا ہے۔

پھر بہت دیر کے بعد باپ کو پتہ چلتا ہے کہ باپ کا پارٹ ادا کرنے میں اس کا اپنا نقصان تھا۔ فائدہ تو ماں کا تھا۔ اس دلسوز انکشاف کے بعد وہ باپ کا بہروپ اتار پھینکنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر کامیاب ہو جائے تو ''دادا'' بن جاتا ہے اور ان رسمی تعلقات کی بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔

باپ کو نہ تو بیٹا سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ایسا شخص جو خود باپ ہو۔ بلکہ صرف ایک آزاد فرد اور یا وہ جو باپ سے نکل کر دادا بن چکا ہو۔

آج کل باپ مروجہ باپ سے مختلف نفسیات اختیار کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ ماں اور عورت کی نفسیت میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ نہ جانے کس مقصد کے لیے ماں یہ نیا تجربہ کر رہی ہے اور نہ جانے کے نتائج کب تک واضح ہوں گے۔

بظاہر یہ تبدیلی تہذیب کا نتیجہ نظر آتی ہے۔ نئی تہذیب کے زیر اثر ماں روز بروز معدوم ہو رہی ہے۔ عورتیں ماں بننے پر ''عورت'' رہنے کو ترجیح دیتی جا رہی ہیں ان کے خیال کے مطابق ماں کی زندگی سے عورت کی زندگی میں زیادہ دلچسپیاں ہیں مگر یہ کب تک قائم رہے گی اس کے متعلق اندازہ لگانا مشکل ہے۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

مشکلات اور محبت

انسان ایک جذباتی حیوان ہے۔ عام حیوانوں کا برتاؤ عام طور پر فطری ہے یعنی وہ حقائق کو نظرانداز نہیں کر سکتے مگر انسان اس نعمت سے محروم نہیں۔ بدصورت عورت کو حسین سمجھنا' دکھ کو راحت سمجھنا اپنی راہ میں خیالی مشکلات قائم کر لینا اس کے لیے چنداں مشکل نہیں۔ پھر انسان کو شعوری حیوان کیوں کہا جاتا ہے۔ غالباً اس لئے کہ اللہ میاں نے اسی کو یہ قدرت بخشی ہے کہ جس قدر جی چاہے حماقت کرے اور حیوان حماقت نہیں کر سکتے اگر کریں بھی تو نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ قدرتی طور پر شعوری برتاؤ کے پابند ہیں۔ انسان اگر شعوری برتاؤ کرے تو عمداً کرے گا غالباً اس لئے اسے شعوری حیوان کہا جاتا ہے۔

انسان کفران نعمت کا قائل نہیں۔ اس لئے وہ اس خداداد نعمت سے جی بھر کر لطف اندوز ہونے کا عادی ہو چکا ہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ہم اس لئے ٹھوکریں نہیں کھاتے کہ چلنا سیکھیں یا ٹھوکریں کھا کھا کر چلنا نہیں سیکھتے بلکہ نئی انوکھی اور دلچسپ ٹھوکریں ایجاد کرتے رہتے ہیں۔

ہمارے آگے پیچھے چاروں طرف دنیا بکھری پڑی ہے اور اپنی ضروریات اور مطلب کے مطابق ہم اسے سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ ہماری اپنی خوشی ہے کہ جس طرح جی چاہے اسے سمجھیں۔ یہ سمجھ بیٹھیں کہ ستارے بڑے بڑے صندوق ہیں تاکہ ہماری تقدیریں ان میں حفاظت سے رکھی جا سکیں۔ یا گھوڑا اس لئے بنا ہے کہ ہم اس پر سواری کریں اور خدا نے عورت اس لئے بنائی ہے کہ ہم اس سے محبت کریں۔ یعنی اس کی آرزو میں کھانا پینا حرام کر لیں اس کے حسن کی تعریف میں شعر لکھ کر اسے بیوفائی پر مائل کریں یا اس سے شادی کر کے اسے اپنا غلام بنا لیں اور خود اس کے خداوند بن بیٹھیں یا اپنی جمع کی ہوئی کمائی لٹانے کا کام اس کے سپرد کر کے خود آرام سے زندگی بسر کریں۔ بہرصورت یہ سمجھنے کا کام ہمارا ذاتی ہے جو جی چاہے سمجھیں یا سمجھنے سے قطعی منکر ہو جائیں۔ ہماری اپنی خوشی ہے۔

چونکہ سمجھنا ہمارے اپنے بس کی بات ہے اس لئے کوئی ایسی بات سمجھنا یا تسلیم کر لینا یا تصور کرنا جو ہمارے دل کے لیے باعث کلفت یا تکلیف ہو ایسی ہی حماقت ہو گی جیسے کوئی پراٹھے کے ہوتے ہوئے خشک روٹی کھا لے اس لئے انسان صرف وہی باتیں سمجھتا' تسلیم کرتا اور تصور کرتا ہے جو اسے مسرت بخشیں۔ یا ایسے خالی نکات پیدا کرتا ہے یا چیز کا وہی پہلو دیکھتا ہے جو اس کے لیے پرلذت

KitaabPoint.blogspot.com

ہو۔غلط فہمی یا غلطی ہمارے فہم کا قصور ہے اور فہم یا سمجھنا ہمارے بس کی بات ہوئی اس لئے ہو رغلط فہمی کی تہہ میں کوئی خوش فہمی ہوتی ہے یعنی کوئی ایسی بات جو اصل میں ہوتی نہیں مگر ہم چاہتے ہیں کہ ہو اور اس لئے سمجھتے ہیں کہ ہے۔

ظاہر ہے جس بات پر ہمارے جذبات برانگیختہ ہوں یعنی جس بات کا ہماری خواہشات سے تعلق ہو اس بات میں ہم سب سے زیادہ "خوش فہمیاں" پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

جس طرح اگر اس عورت کی ناک بھدی ہو جو ہمیں محبوب ہے تو ہم اس بھدی ناک کو ستواں دیکھنا شروع کر دیں گے یا اس کی آنکھوں اور ہونٹوں میں مزید حسن پیدا کر لیں گیتا کہ اس بھدی ناک کے باوجود ہم اسے دنیا بھر کی حسین ترین خاتون سمجھ سکیں ایسے ہی ہر وہ موضوع جس کا تعلق ہمارے جذبات سے ہے ہماری ایسی خود ساختہ اندھی خوش فہمیوں سے بھر جائے گا مثلاً محبت ایسا موضوع ہے جو ہمارے جذبات اور خواہشات سے تعلق رکھتا ہے۔جبھی ہم نے اس موضوع کو خوش فہمیوں سے بھر رکھا ہے۔

عام حیوانوں کی زندگی محض ایک بے کیف سا تسلسل ہے مثلاً پالتو گھوڑے کو ہی لیجئے صبح سویرے اٹھا۔مختصری ضد اور احتجاج کا مظاہرہ کر کے تانگے میں جتنا منظور کر لیا۔پھر چلتے چلتے شام ہوگئی۔اس زندگی کے بے کیف تسلسل میں وہ بے چارا صرف اس قدر دلچسپی پیدا کر سکتا ہے کہ کبھی پورب کی بجائے پچھم کو مڑ جائے یا آگے چلنے کی بجائے پیچھے دھکیل کر گاڑی بان کو پریشان کر لے تو عام حیوانوں کی زندگی مقابلتاً صراط مستقیم ہے۔

صراط مستقیم سیدھا سہی مگر اب خشک اور بے کیف راستہ ہے۔ایک روانی ہے جس میں اتار چڑھاؤ نہیں اگر انسا نبھی فطری برتاؤ پر پابند ہو جائے تو اس کی زندگی بھی صراط مستقیم ہو جائے گی مگر اس کے برعکس انسان کی زندگی اتار چڑھاؤ سے بھرپور ہے۔اگر انسان کو تھوڑی سی قدرت حاصل ہو تو وہ کیوں اپنی زندگی کو بے کیف تسلسل بننے دے۔وہ اپنی زندگی کو دلچسپ بنانے کے لیے اپنے لئے نئی نئی مشکلات پیدا کرتا ہے چونکہ اس خطہ زمین پر قدرتی مشکلات اتنی نہیں ہیں کہ زندگی کو انسان کے لیے حسب ضرورت اور دلچسپ مشکلات پیدا کرنے میں کیسا سرگرم رہتا ہے پہلے ایک مشکل پیدا کر لی پھر اسے طے کرنے کی جدوجہد میں لگے رہے اور اسے اس سلیقے سے طے کیا کہ اس عمل میں دو مزید مشکلات پیدا ہو جائیں تا کہ باقی وقت ان مشکلات پر رونے میں صرف ہو اور یہ چکر یونہی چلتا رہے۔

غالباً سب سے پہلی مشکل یا ٹھوکر جو انسان نے زندگی کو دلچسپ بنانے کے لیے ایجاد کی گناہ تھا یعنی احساس گناہ' چند ایک ممنوعات قائم کرنے سے زندگی کس قدر دلچسپ ہو گئی حالانکہ اس زمانے میں لوگ اس بات سے قطعی ناواقف تھے کہ کشش ثقل نہ ہو تو

KitaabPoint.blogspot.com

درخت نہیں اگ سکتے اور رکاوٹ نہ ہو تو حرکت ممکن نہیں۔

دوسری مشکل جو انسان نے ایجاد کی ''محبت'' تھی۔ پھر اس دلچسپ مشکل کو اور بھی دلچسپ اور دشوار بنانے کے لیے اسے جنسیات اور جسم سے علیحدہ کر کے اس میں روحانیت کی کلی ٹانک دی۔

پھر حسب ضرورت ان مشکلات میں اضافہ کرنا پڑا تو مشین' بیوی' ہیر ہٹلر' سرمایہ داری' کیمونزم اور فیشن اختراع کئے گئے۔

ان سب اختراعات کے باوجود ''ممنوعات'' اور گناہ سے بہتر کوئی مشکل قائم نہ ہو سکی چونکہ اس چھوٹی سی مشکل نے اپنے آپ سینکڑوں مشکلات اور ٹھوکریں پیدا کر دیں اور ہمیشہ کرتی رہی اور زندگی میں ایسے رنگ بھر دیے کہ انسان خود اپنی اس شاہکار پر ناز کرتا ہے۔ چونکہ ''ممنوعات'' کی وجہ سے ہی پیدا ہوا یعنی ہمارے وہ جذبات جو ہمیں اجتماعی طور پر ناپسند تھے پردے میں ظاہر ہوئے یا یوں کہئے کہ اپنے اظہار کے لیے انہوں نے انوکھے پردے ایجاد کئے۔ یعنی جھوٹ پیدا ہوا۔ پھر عورت نے ''جنسی ضروریات'' کو ممنوع ہوتے ہوئے دیکھ کر حفظ ماتقدم کے خیال سے جھوٹ اور پردہ اپنی سرشت میں داخل کر لیا۔ پھر مرد نے اپنے لئے خوش فہمی کے پردے میں یہ ستم ظریفی ایجاد کی کہ عورت کو مزید پردے میں ڈال دیا۔ یعنی پردہ اور جھوٹ اور پھر پردہ۔ اس طرح مرد نے اپنے فتہائے محبت کو ایک ایسا بھنور بنا دیا کہ محبت زندگی کی بہترین مشکل یعنی لذت ہو گئی اس کے بعد عورت سے احساس رقابت اور احساس کمتری اخذ کر کے اپنی محبوبہ کے فراق اور اس کی بیوفائی پر بیٹھ کر رونا شروع کر دیا اور جب رو رو کر تھک گئے یا جب یہ احساس ہوا کہ رونے سے رہی سہی عزت خاک میں مل جائے گی تر در پردہ رونا شروع کر دیا اور لوگوں میں یہ پرچار کرنا شروع کر دیا کہ یہ رونا نہیں راگ اور شاعری ہے۔

اگر محبت سے خلش رقابت احساس کمتری آہ و نالہ اور گریہ شب گیری نفی کر دیے جائیں تو باقی کیا رہ جاتا ہے گائے بھینسوں کی سی محبت اور حقیقت میں محبت ہے بھی یہی۔ ایک جنسی کشش جو ایک مختصر سے جنسی ملاپ پر مائل کرے مگر ہم نے اسے جسمانی دنیا سے خارج کر کے دماغی اور جذباتی بھنور بنا لیا ہے اور یہ آسان سی اختراع پیدا کر کے اسے ایک ہمہ گیر مسئلہ بنا رکھا ہے۔

انسان کہتا ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس وسیع کائنات کا مقصد صرف اس قدر سیدھا سادا اور بے کیف ہو۔ نہیں اس شاندار اور وسیع دنیا کا مقصد بلند تر پر اسرار ہونا چاہیے جس قادر مطلق نے اس دنیا کی تخلیق کی ہے اور خاص طور پر جس نے یاسی حسین اور رنگین اشرف المخلوقات بنائی ہے وہ کیسے اپنی بہترین مخلوق کا مقصد حیات گائے بھینسوں کا سا بنا سکتا ہے یہ اس کے اور اس کی بہترین مخلوق کے شایان شان نہیں کہ انسان صرف اسی لئے پیدا کیا جائے کہ کھائے پیئے ملے جلے اور سو رہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

اور حیوانوں میں غالباً محبت ایک منفرد جذبہ ہے مگر انسان کے لئے مرکب۔ اگر مرکب جذبہ نہ ہو تو محبت کرنے والے کو جذبات کے جھولے میں جھولنا نصیب نہ ہو اور جذباتی اضطراب کی لذت حاصل نہ ہو سکے جب تک کشش کے ساتھ متضاد جذبہ شامل نہ ہو محبت کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ محبت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جب تک محبوبہ کے متعلق اپنی کمتری کا احساس نہ ہو۔

یعنی جس سے محبت ہو جائے ہم اسے بلند تر ہستی سمجھنے پر مصر ہوتے ہیں اور ہمارے دل میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم اس محبوبہ کے قابل نہیں۔ اگر ہم نے اسے ہاتھ بھی لگایا تو وہ میلی ہو جائے گی اگر وہ ہم سے ایک ساعت کے لیے ہنس کر بات کرے تو اس کی بندہ نوازی اور کرم پر سورج' چاند اور ستارے حیرانی سے انگشت بدنداں رہ جائیں گے۔ ایسی ہستی سے چاہے وہ محبوب ہی کیوں نہ ہو تھوڑا سا ڈر محسوس ہونا لازمی ہے۔ پھر کوئی چپکے سے ہمارے کان میں کہہ دیتا ہے "بھئی ہوش کی دوا کرو کہاں وہ عالم پاک اور کہاں تم ذرہ خاک" ان کی اور تمہاری کیا نسبت حتیٰ کہ یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ہماری ہونا کب گوارا کرے گی۔ یقینی طور پر وہ کسی ایسے کی ہو جائیگی جو اس کے قابل ہو اس وقت سب سے ناقابل شخص ہم خود ہو جاتے ہیں اور کوئی مرد جس کے شانوں پر سر ہو جس پر کلاہ رکھا جا سکے ہمیں اپنا رقیب نظر آتا ہے۔ پھر ہمارے دل میں ایک آگ سی سلگتی ہے اور ایک درد سا پیدا ہو جاتا ہے جی رونے او مرنے کو چاہتا ہے۔ یعنی ہمیں محبت ہو جاتی ہے۔ وہ وقت محبوب سے ملنے کی کوشش کرنے کے بجائے تارے گننے' کروٹیں بدلنے' شعر کہنے اور گانے کے لیے زیادہ موزوں ہوتا ہے اور ہم خیالی دنیا میں اپنے رقیبوں کو اپنی محبوبہ سے ملتے ہوئے دیکھتے ہیں حتیٰ کہ اس کے مقدس کوچے میں ایک بھیڑ لگ جاتی ہے اور ہماری گنجائش ہی نہیں رہتی یا شاید ہم اپنی غیر موجودگی سے اپنے آپ میں امتیاز پیدا کر لیتے ہیں اس وقت ہم اپنی محبوبہ کو ظالم اور ستمگر سمجھتے ہیں اور اس کے نقاب میں ابھرے ہوئے تار دیکھ کر ہم اندازہ لگاتے ہیں۔ "کس کی نگاہ ہو گی" پھر ہم اپنی وفا پر پھولے نہیں سماتے جو ان ابھرے ہوئے تاروں اور اس کوچے میں گنجائش نقش پا نہیں ہے' کے باوجود قائم رہتی ہے۔

یعنی ہم اس وقت محبوبہ سے زیادہ وفا کے متمنی ہوتے ہیں اور وفا جب ہی ایک بلند تر وصف ہو سکتی ہے جب وہ فلاں' فلاں باتوں کے باوجود قائم ہے جو بیوفائی پر مائل کر رہی ہوں۔ یعنی غم دے رہی ہوں۔ یعنی وفا غمخواری کی محبت ہے یعنی ہم محبت کرنے کے بجائے غم خوری سے زندگی میں دلچسپیاں پیدا کرتے ہیں۔ اس وقت اپنی وفاداری اور محبوبہ کی بے وفائی کی وجہ سے ہم وفا کی بلندیوں پر بیٹھ کر محبوبہ کو قعر بے وفائی میں دیکھتے ہیں اور خود کو بلند تر محسوس کرتے ہوئے محبوبہ سے چوری چوری نفرت کرتے ہیں یہ کشش ڈر رقابت نفرت کے احساس میں مل کر محبت بن جاتی ہے اور یہ کشش اور نفرت کی آری چلتی ہے جو لہروں کی طرح اپنا اتار چڑھاؤ قائم رکھنے کے لیے کسی بیرونی طاقت کی محتاج نہیں۔ اگر محبت ایک منفرد جذبہ ہوتی تو سعی وصال کو وفا پر دیں قربان نہ کیا جاتا۔ اس میں لہروں کا سا

KitaabPoint.blogspot.com

مدوجزر نہ ہوتا بلکہ ہم وقتی کشش محسوس کرتے ہیں اور پھر وقتی ملاپ کے بعد وقتی سکون یعنی ہم نے بھی عام حیوانوں کی طرح کشش اور نفرت کو ملا کر گوندکر اپنی محبت میں دوام یعنی وفا پیدا کر لی ہے اور "میں کچھ بھی نہیں" "میں بھی کچھ ہوں" پہیئے بنا کر زندگی کے جمود میں حرکت ایجاد کر رکھی ہے۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ ہر مرد کی محبت کی تفصیلات یہی ہیں ہر شخص اپنے جذبہ محبت کی تفصیلات اپنے ذاتی مذاق اور طبیعت کے مطابق اختراع کرتا ہے۔ اس کے متعلق ہم کوئی ایک اصول قائم نہیں کر سکتے ہمارا اپنا مذاق ہے چاہے ہم اپنے محبوب کو فرشتوں کی سی پاکیزگی بخش دیں اور اپنے آپکو حرام کر لیں یا بیوہ کی سی ذلت عطا کر دیں۔ مگر دو متضاد جذبات پیدا کرنے لازمی ہیں ورنہ محبت ممکن نہیں ہو سکتی۔

انسان تو کیا دنیا میں مادی چیزوں کے متعلق بھی کوئی اصول قائم نہیں ہو سکتا دو دن پورے طور پر ایک دوسرے کے مطابق نہیں ہر مشین میں اپنی ذاتی خصوصیات موجود ہیں جو اس کو دیسی مشینوں سے ممتاز کرتی ہے۔ کبھی آٹے کی چکی کی آواز سنئے چخ چخ چھک چخ چخ چھ چخ چخ چخ چخ یہ چخ اور چھک کسی اصول کے ماتحت نہیں۔

ہر موٹر اپنے ڈرائیور کی طبیعت کے مطابق ہو جاتی ہے اگر ڈرائیور دلیر ہو تو انجن پہیوں کو دلیری سے دھکیل لے جاتا ہے اور اگر وہ خوف سے کانپنا شروع کر دے تو انجن بھی ڈر کے مارے شل ہو جاتا ہے۔ یعنی جس طرح لڑائی میں گھوڑے حملے کے وقت سواروں کی نفسی کیفیت کے مدنظر ڈرپوک یا دلیر ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح موٹر کی طبیعت اور شخصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دنیا میں خالص اصول کوئی نہیں۔ یہ تمام اصول تقریباً "اصول" ہیں اس لئے محبت کے متعلق بھی یہ تقریباً اس مشکل سازی کی وجہ سے جو صدیوں سے چلی آتی ہے انسان میں عجیب اور انوکھے عناصر پیدا ہو چکے ہیں جنہیں بیان کرنا یا سمجھنا میرا کام نہیں۔ ایک لکھ پتی لاکھوں روپے دان کر دے گا مگر اپنی پرانی قمیض بھنگی کو دینے سے ہچکچائے گا۔ ایک بہادر جنگ میں ہزاروں کا خون کر دے گا مگر گھر میں کسی چھوٹی سی بات پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا۔

ملکہ وکٹوریہ کسی مشہور پھلوں کے باغ سے گزری تو باغ کے مالک نے میوے کی ایک بڑی ٹوکری بطور نذر پیش کی۔ ملکہ نے گھر پہنچ کر زمیندار کو شکریہ کا خط لکھا۔ خط پڑھ کر آپ کہنے لگے یہ شکریہ تو خیر ٹھیک ہے مگر ملکہ نے یہ نہیں لکھا کہ وہ ٹوکری کب واپس کرے گی۔

کپرن نے تحریر کیا ہے کہ کسی صاحب کو مردے کے کفن کی ڈوری باندھنی پڑی۔ دھاگہ بہت چھوٹا تھا آپ غیر شعوری طور پر

KitaabPoint.blogspot.com

لوپ گرہ دینے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ مگر دفعتاً خیال آیا کہ آخر کفن کو لوپ گرہ کی کیا ضرورت تھی۔ وہ گرہ اب کسی کو بھی کھولنی نہ تھی وہ گرہ اب کبھی نہیں کھلے گی۔ اس خیال سے اس کے دل میں موت کا ایسا تصور پیدا ہوا کہ کانپ کانپ اٹھا۔ موت بذات خود اس پر کچھ اثر نہ کر سکی مگر ایک کبھی نہ کھلنے والی گرہ کے خیال سے اس نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے اس کا ذرہ ذرہ موت کے مفہوم سے شناسا ہو جیسے وہ پہلی مرتبہ موت کو اپنے روبرو دیکھ رہا ہو۔ کبھی تو محبت کے زیر اثر مرد اپنی ذات یا نفس کو خارج کر کے ایسی ایسی قربانیاں کر بیٹھتا ہے کہ بعد میں خود ہی اپنے طرز عمل پر حیران ہوتا ہے اسے وہ فعل اپنی طبیعت کے لحاظ سے قطعی بیگانہ محسوس ہوتا ہے کبھی اپنی ذاتی خوشی کے لیے دنیا کو خس و خاشاک سمجھ کر ٹھکرا دینے کیلیء تیار ہو جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ انسان کا اپنے نفس یا ذات کو خارج کر دینا اپنے نفس یا ذات کو مزید تقویت دینے کا ایک انوکھا طریقہ ہو۔ ہم فقیر پر اس لیے ترس نہیں کھاتے کہ وہ قابل رحم ہے بلکہ اس لیے کہ ہم خود اس قابل ہیں کہ لوگوں پر ترس کھا سکیں یا جب کبھی ہم کسی کوڑھی کو ایک پیسہ خیرات دیتے ہیں تو در حقیقت وہ پیسہ ہم کوڑھ کے مرض کو دیتے ہیں کہ ہم پر وبار کے یا اللہ میاں کو دیتے ہیں اور چپکے سے دل میں کہتے ہیں "اللہ میاں یہ میری سخاوت کا ثبوت دیکھ لیجیے میں ایسا برا نہیں کہ کوڑھ کا مستحق ہوں آپ تو خود سیانے ہیں" ہم باہر سیر کے لیے جاتے ہیں کہ جب لوٹیں تو گھر زیادہ دلچسپ نظر آئے۔ روٹھتے ہیں تاکہ جب مان جائیں تو از سر نو ملاپ کا لطف حاصل ہو۔ اسی طرح نفس کا یہ اخراج شاید واپسی کی لذت حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔

مرد نے اپنی محبوبہ سے محبت کرنے کے لیے کئی ایک دلچسپ اور انوکھے طریقے ایجاد کر رکھے ہیں جو کسی دن پری جمال عورتوں کی آپ بیتیوں سے اخذ کئے جائیں گے۔

میں نے امرتسر کے ایک حسین نوجوان کو دیکھا ہے جس نے اپنی تمام دولت ایک رقاصہ پر لٹا دی اور پھر فقیر ہو کر اسی کی دہلیز پر بیٹھ گیا۔ ہر چند دنوں کے بعد اپنی محبوبہ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے وہ سیڑھیاں چڑھ جاتا مگر رقاصہ کے حواری اسے زبردستی سیڑھیوں سے نیچے لڑھکا دیتے اور وہ لڑھکتے لڑھکتے دھم سے دہلیز پر آ گرتا۔ گویا اس کی زندگی کا مقصد ہی یہی تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کی سیڑھیوں سے لڑھک لڑھک کر دھم سے دہلیز پر جا گرے۔

یہ عدم تعاون، عدم تشدد اور بھوک ہڑتال یا ہڑتال کا نظریہ جو گاندھی جی نے پیش کیا تھا یقیناً کسی عاشق کی ایجاد ہے اور ایسی اپیل ہے جو ظالم کے جذبات پر اثر تو رکھتی ہے بشرطیکہ اس ظالم کو مظاہرہ کرنے والے کے جذبات سے کوئی تعلق ہو۔

شاید آپ ایسے برتاؤ کو ذہنی یا دماغی انحراف سمجھیں۔ اگر یہ ذہنی انحراف ہے تو دنیا ہی انحراف ہے اور صراط مستقیم انسا نتو کیا شاید

KitaabPoint.blogspot.com

گائے بھینسوں کو بھی نصیب نہیں۔ اگر انحراف ہی انسان کے لیے خوشی کا باعث ہو تو ہر محبت کرنے والے نے ایسی سیڑھیاں ایجاد کر رکھی ہیں جن سے اسے لڑکا دیا جا سکے ہر شخص نے اپنی شخصیت میں ایک چھوٹا سا پرائیویٹ محبت کا نفس پیدا کر رکھا ہے جو اس کے زیر اثر پیدا ہوتا ہے لوگ کھلے بندوں ظاہر کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اس لذت کو قطعی پرائیویٹ رکھتے ہیں۔

"مغربی" محبت بظاہر مختلف نظر آتی ہے اس لئے کہ آب و ہوا اور جغرافیائی حالات کا اثر طبیعت کے علاوہ انداز محبت پر بھی ہوتا ہے یا شاید اس لئے کہ وہ "نائیس" کی سی محبت سے اکتا کر اب آزادانہ محبت کا تجربہ کر رہے ہیں۔ یعنی آئے بیٹھے ملے جلے اور پھر تسکین ہی تسکین۔ "مغربی" معاشرت حاضرہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزادانہ محبت کا دور جدید اب ختم ہونے کو ہے۔ انہوں نے اس تجربے کو تسلی بخش نہیں پایا اس جدید انداز محبت کو رائج ہوئے ابھی دیر بھی نہیں ہوئی پھر وہ ابھی سے کیوں اکتا گئے وہ "ڈان گوا گزوٹ" والا انداز محبت اتنی صدیاں کیوں کر رائج رہ سکا۔ ایشیا میں وہی پرانا انداز محبت چل رہا ہے۔ آخر وہ احمقانہ طریق محبت کیوں اس قدر پائیدار ثابت ہو رہا ہے زمانہ تاریخ سے پہلے بھی آزادانہ محبت رائج تھی پھر دنیا مہذب ہوگئی تو آزادانہ محبت ترک کردی گئی۔ ان باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو سکون راس نہیں اور اسے وہی پرانا طریق محبت منظور ہے یعنی انسان ایک غم خور جذباتی حیوان ہے۔

علماء کا خیال ہے طربیہ کی نسبت المیہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے جو صحیح طور پر زندگی کو پیش کرتی ہے غالباً اسی لئے انسان اپنے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر کے اپنے فتہائے آرزو کو خود ہی پامال یا ناممکن کر کے اپنی غم خوری کی عادت پوری کرنے کا عادی ہو چکا ہے انصاف سے دیکھئے تو خوشی کی نسبت غم ہمارے جذبات میں کہیں زیادہ گہرا اور دیرپا تحرک پیدا کرتا ہے اسی طرح غم دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اس جذباتی تحرک کو لذت کہتے ہیں لیکن اس تحرک کو پائیدار بنانے کے لئے دو ایسی متضاد طاقتوں کا ہونا لازمی ہے جو بیک وقت کھینچا تانی کریں۔

اگر انسان غم خوری کا مشتاق نہ ہوتا تو سرمایہ دار آمریت سے ختم ہو چکے ہوتے لیکن صورت احوال یہ ہے کہ ایک مدت اور سوشلزم آپ اپنا منہ چڑا رہے ہیں اور "یو این" اپنی تسلی کے لیے بڑبڑا رہی ہے۔ "جنگ کے اثرات نمایاں ہوں تو صلح کا پرچار بے معنی ہے" اگر محبت دائمی کشش کا نام ہوتا تو جج بی لنڈ سے "عارضی شادی" کی قرارداد پیش نہ کرتے اور عورت کو ملکیت بناتے اور خود خداوند بن جاتے۔ پاکستانی مردوں کی شاعری میں برچھیاں اور بھالے نہ چلتے اور بچے گہرے جذباتی تحرک سے محروم رہنے پر صبح اور شام کی سطحی اور پھیکی خوشی سے اکتا کر بڑا ہونے کی آرزو نہ کرتے۔

KitaabPoint.blogspot.com

اہل مغرب نے مقابلتاً اپنی زندگی سے غم کو خارج کر کے مصیبت مول لے لی ہے۔ تفریح گاہیں' جلسے' پارٹیاں' باتھ' بال' کارنوال اور نہ جانے کیا سب مل کر اتنا جذباتی ہیجان پیدا نہیں کر سکتے جو ایک چینی بھدے سے دلبر پر بھدی آواز میں بھدے گیت گا کر پیدا کر سکتا ہے۔ اہل مغرب کو تفریح کا بخار کیوں چڑھا ہوا ہے؟ آخر انہیں اس قدر تفریح کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے۔ اس لئے نہیں کہ ان کا دل مزید خوشی کا متمنی ہے بلکہ اس لئے کہ روکھی خوشی جذباتی مدوجزر پیدا نہیں کر سکتی جیسے ''فاحشہ'' ہاتھ میں کاسہ لئے اس لئے دربدر نہیں پھرتی کہ بھیک سے اس کا پیٹ نہیں بھرتا اس لئے نہیں کہ اس دربدر پھرنے کی عادت ہے بلکہ اس لئے کہ اسے کہیں سے بھیک نہیں ملتی اور وہ اس امید پر دربدر پھرتی ہے کہ شاید یہاں سے کچھ مل جائے۔ اسی طرح اہل مغرب بھی تفریح کے سراب کے پیچھے دیوانہ وار بھاگ رہے ہیں لیکن ہاتھ لگا پھر وہ لہر ریت بن کر رہ جاتی ہے اور یہ سب صرف اس لئے ہے کہ وہ غم کو اپنی زندگی سے خارج کر چکے ہیں۔

ہمارا جذبہ محبت کئی ایک پردوں میں ظاہر ہوتا ہے ہم نفرت' غصہ' دشمنی' خوف' احترام اور نہ جانے کن کن پردوں کی اوٹ میں محبت کرتے ہیں اور بارہا محبت کے پردے میں نیچا دکھانے' انتقام لینے اور نہ جانے کونسے انوکھے اور پوشیدہ جذبات کا اظہار کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ ہمیں خود یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم درپردہ محبت کر رہے ہیں یا محبت اور حقیقت ایک پردہ ہے یا شاید ہر جذبے کا گہرا تموّج ہمارے نفس کو یوں پھیلا دیتا ہے کہ محبت کی میٹھی ہوئی شکر گھل کر مٹھاس پیدا کر دیتی ہے یا شاید جذباتی تموج ہمارے لئے اس قدر باعث لطف ہوتا ہے کہ ہم نفرت خیز ہستی کو جو ہمیں لذت بخشتی ہے پیار کرنا شروع کر دیتے ہیں یا شاید دل کی دنیا پر بھی وہی اصول حاوی ہے کہ ہر حرکت کے ساتھ آپ ہی آپ متضاد حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔

بہر صورت یہ مسلمہ امر ہے کہ بڑی نفرت' شدید ڈر اور محبت میں چنداں فرق نہیں۔ شاید ہر جذبہ کو انتہا محبت ہو۔ درپردہ محبت اور امتیاز عداوت یا نفرت کا نکتہ شعراء نے عالموں سے پہلے جان لیا تھا۔ اس دور بین بڈھے غالب نے ''کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی'' کسی بات پر چاہا تھا خوف غصہ نفرت سے جذبات محبت کی طرح مثبت احساسات میں منفی نہیں اور کشش کے خلاف توازن قائم رکھنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں بہر صورت کشش اور نفرت محبت کی گاڑی کے پہیے ہیں جس کے بغیر یہ رنگیلی رتھ چلتی نہیں اور غم اور خوشی کے اتار چڑھاؤ کے بغیر جذباتی لات ممکن نہیں۔

◆◆◆

KitaabPoint.blogspot.com

پکا کر کھانا

روٹی کے متعلق سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ اسے کھا نہیں سکتے جب تک وہ پکائی نہ جائے۔ یہ ایک حقیقت عظیم ہے جو ہر کسی پر آشکار نہیں ہوتی اور اپنے دامن میں بیسیوں حقیقتوں کو لئے ہوئے ہے۔

پرانے وقتوں میں یہ خیال عام تھا کہ کمائے بغیر کھانا ممکن نہیں' لیکن سرمایہ داری کے زمانے میں لوگ اس بات پر شک کرنے لگے اور گزشتہ جنگ عظیم نے کئی ایک اہم انکشافات کرنے کے علاوہ کمانے کے ڈھونگ کی قلعی کھول دی اور واضح کر دیا کہ چاہے آپ کتنا ہی کمائیں ضروری نہیں کہ آپ کو کھانے کو مل جائے بلکہ روٹی کمائی نہیں جا سکتی چونکہ روٹی کمائی نہیں جا سکتی چونکہ روٹی اور پیسہ دو مختلف چیزیں ہیں یہ سب گزشتہ جنگ کی برکتیں ہیں۔

پکا کر کھانے کی اہمیت کو ہمارے آبا نے خوب سمجھا تھا۔ اس کو تکمیل دینے کے لیے انہوں نے پتھر کے اوزار بنانے شروع کر دیئے تا کہ پتھر سے پتھر رگڑنے کا موقعہ پیدا ہو اور آگ کا ظہور ہو جائے جو پکانے کے عمل کو ممکن کر سکے لیکن آپ جانتے ہیں کہ حقیقتیں اور چیزیں پرانی ہو کر عام ہو جاتی ہیں اور پھر آنکھ سے اوجھل۔

اس حقیقت کو آنکھ سے اوجھل کرنے میں برطانیہ نے بڑا حصہ لیا۔ جیسے کہ برطانیہ کو ہر بات میں بڑا حصہ لینے کی عادت ہے۔ اس نے اگانا ترک کر کے پرچار کرنا شروع کر دیا کہ کھانے سے پہلے ضروری ہے کہ چیزیں دساور سے منگوائی جائیں۔ حتیٰ کہ پاکستان بھی گندم دساور سے منگوانے لگا۔ اور دساور سے منگوانا فیشن ہو گیا اور لوگوں کی تمام تر توجہ منگوانے پر مرکوز ہو گئی اور پکانے کی بات پس پشت پڑ گئی۔ مغربی ہوٹلوں نے اس بات کا فائدہ اٹھانا شروع کر دیا جیسے کہ مغرب والوں کی عادت ہے کہ ہر بات کا فائدہ اٹھایا جائے۔ اس طرح پکانے کا عمل ایک راز بن گیا اور لوگ سمجھنے لگے کہ چیزیں اسی صورت میں اگتی ہیں یا اسی صورت میں دساور سے آتی ہیں کھیت پکی ہوئی ڈبل روٹیاں اگلتے ہیں دودھ بوتلوں میں پیدا ہوتا ہے اور مچھلیاں ٹین کے ڈبوں میں پائی جاتی ہیں۔

پاکستان میں بیویوں نے پکانے کی اہمیت کو سمجھ کر اسے اپنانے کے لیے کما کر کھانے کا مسئلہ پیش کر دیا اور پھر مردوں کو کمانے کی چکی میں جھونک دیا اور آپ بیٹھ کر پکانے اور کھانے کے عمل پر قابض ہو گئیں۔

اس طرح مرد محض کھانے والا جانور رہ گیا اور محض کھانا تو جانور بھی جانتے ہیں دراصل انسان تو پکا کر کھانے والا جانور ہے۔

KitaabPoint.blogspot.com

بولنے والا نہیں بولنا عورتکا وصف ہو تو ہو لیکن انسان کا خاص امتیاز نہیں بلکہ بولنا تو ایسی بری عادت ہے جو جملہ مشکلات پیدا کرتی ہے۔ جبھی سیانے لوگوں نے بول بول کر جیل جانے کی بجائے گھر بیٹھ کر چپ چاپ لکھنا شروع کر دیا تا کہ بات کہہ بھی دی جائے اور بولنے کے قبیح نتائج سے بچاؤ بھی رہے۔

مقابلتاً اہل پاکستان نے پکانے کی اہمیت اور عظمت کو خوب سمجھا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں کسی خاوند کو چند ایک دن بیوی سے پرے رہنا پڑ جائے تو معاً اسے روٹی کی تکلیف ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اگرچہ کھانے کو روٹی ملتی ہی کیوں نہ رہے لیکن پکی پکائی کی حقیقت سے خوب واقف ہیں آپ پکی پکائی کھانا تو ایسا ہے جیسے بیر کھا لئے جائیں۔

پکانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس عمل میں اک اہتمام پیدا کیا جاتا ہے اور زندگی بذات خود اہتمام کے سوا اور ہے کیا۔ میں چائے صرف اس لئے پیتا ہوں کہ چائے پینے میں اہتمام ہوتا ہے اور لسی بس گلاس میں ڈالی اور یوں پی گئے جیسے لسی نہ ہوئی دوا ہوئی۔ چائے کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ چاہے آپ اسے اپنے ہاتھ سے نہ پکائیں پھر بھی آپ اسے بنا کر پی سکتے ہیں اور اہتمام جوں کا توں قائم رہتا ہے آپ کے سامنے بھرا ہوا ٹرے آ جاتا ہے کھانے کی چیزوں سے قطع نظر یہ دودھ دان ہے یہ شکر دانی یہ پاٹ اور یہ پیالے اور چمچے دیکھتے ہی ''بیش و بسیار'' کا احساس ہوتا ہے۔ شکر کا چمچہ بھرا چائے دانی کو سڑ کیا اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر جملہ چیزوں کے کمتر ہونے پر ہمدردی محسوس کرنے لگے۔ پھر چائے بنائی او مزے مزے سے چسکیاں لیتے رہے۔ پیتے ہوئے اپنی اہمیت کا احساس چھائے جاتا ہے اور پی لینے کے بعد تار کی طرح بندھ جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا آپ صرف کھانے پینے کے لیے پیدا کئے گئے ہوں۔ بڑی نعمت یہ ہے کہ یہ احساس چونکہ صرف اس احساس سے زندگی بن جاتی ہے۔

چائے پینے والا مفکر ہو سکتا ہے سائنسدان ہو سکتا ہے شاعر ہو سکتا ہے۔ مجبور عاشق نہیں ہو سکتا چونکہ مجبور عاشق کو اتنی فرصت کہاں اور پھر چینی کے ظروف کروٹیں بدلنا پسند نہیں کرتے شاید اسی لئے اہل مغرب عاشق نہیں ہوتے۔

اور لسی: فرض کیجئے آپ کہیں جا رہے ہیں راستے میں آپ نے لسی پینے کی ضرورت محسوس کی۔ اول تو آپ کو چاروں طرف دکان ڈھونڈنے کے لیے جھانکنا پڑے گا چونکہ ایسی دوکان پر بورڈ تک نہیں لگا ہوتا مل گئی تو آپ کو مجرموں کی طرح کھڑا ہونا پڑے گا۔ پھر گلاس منہ میں الٹا آستین سے ہونٹ پونچھ یوں چل دیں گے آپ جیسے پیچھے پولیس آ رہی ہو اور اگر خدانخواستہ آپ کے منہ پر مونچھ ہے اور گھر میں بیوی ہے تو قطعی طور پر آپ یہ بات چھپا نہیں سکتے کہ آپ لسی پی آئے ہیں۔ اس کے برعکس بازار میں چائے پیجئے تو اور بھی لطف رہتا ہے۔ ''ٹی شاپ'' کا بورڈ فوراً آپ کو متوجہ کرے گا ایک وسیع و عریض خوبصورت کمرہ پھر حضور کہنے والے وردی پوش یہ

KitaabPoint.blogspot.com

تمام تر اہتمام آپ کو احساس دلائے گا کہ کمرہ میں بیٹھے ہوئے جملہ احباب آپ کے خرچ پر کھا پی رہے ہیں۔ بیوی کی بات چھوڑیئے چاہے رمضان کا ہی مہینہ ہو اور چاہے آپ کے منہ پر مونچھ داڑھی بھی ہو کیا مجال ہے جو کسی پر ظاہر ہو جائے کہ آپ چائے پی کر آئے ہیں۔ اگر سٹیشن کے سٹال پر پئیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پلیٹ فارم پر بیٹھی ہوئی خواتین آپ کو تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں اور گاڑیاں رف آپ کے حکم کی منتظر ہیں۔

ہاں تو بات پکانے کے اہتمام کے متعلق تھی پکانے کا اہتمام دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کسی خالص پاکستانی گھر میں جا کر دیکھئے۔ سارا سارا دن اہتمام جاری رہتا ہے چاہے کھانا ایک وقت میسر ہو لیکن اہتمام میں فرق نہ پڑے گا۔ مختلف قسم کی آوازیں آئیں گی۔ چیزیں ادھر سے ادھر ہوں گی پھر ادھر سے ادھر ہونے لگیں گی حمام کے سامنے برتنوں کی قطار لگ جائے گی پھر یہ قطار باورچی خانے کی طرف چل پڑے گی اور پھر نہ جانے کہاں کہاں سے ہوتی ہوئی از سر نو حمام کے سامنے آ پہنچے گی۔ غرضیکہ آپ محسوس کریں گی کہ آپ میلے پر آئے ہوئے ہیں اور آپ کو اکبر کا قول یاد آئے گا کہ کھاؤ پیئو اور جیو۔

اس اہتمام کے ضمنی فائدے ان گنت ہیں۔ مثلاً عورتوں کو اتنا ہوش بھی نہیں رہتا کہ پڑوس میں رہنے والے بابو کو کوٹھے سے جھانکنے کی عادت ہے۔ اور چاہے کوٹھے کے سامنے بیٹھی برتن مانجھتی رہیں انہیں مطلقاً احساس نہیں ہوتا کہ انہیں جھانکا جا رہا ہے اور اگر ہو بھی جائے تو وہ بھاگ کر چھپ جائیں گی۔ اس لئے نہیں کہ انہیں دیکھے جانے سے دلچسپی نہیں بلکہ اس لئے کہ انہیں برتن مانجھتے ہوئے دیکھے جانا گوارا نہیں چونکہ یہ بات تو بڑی دیر اور تجربے کے بعد ان پر واضح ہوتی ہے کہ سنگار کرتے ہوئے یا برتن مانجھتے ہوئے دیکھے جانا دونوں کے نتیجے میں چنداں فرق نہیں۔

مغربی عورت نے پکانا چھوڑ کر مصیبت مول لے لی ہے اسے اپنے آپ سے جان چھڑانا مشکل ہو چکا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے آپ سے کیا کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نت نیا شغل پیدا ہوا۔ کسی نے ''بیدنگ'' چلا دیا تو گھاٹ آباد ہو گئے اور شہر ویران پھر کسی نے دھوپ اشنان ایجاد کر دیا تو روپیلے جنگل وجود میں آ گئے اور یہ سب محض نہ پکانے کی بدعتیں ہیں۔

محض کھانے سے کھانے کے فعل کی عظمت کا اظہار نہیں ہوتا۔ بیٹھے کھایا اور اٹھ بیٹھے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے آپ کھلانے والی لے پالک ہوں چاہے وہ آپ کی بیوی ہی کیوں نہ ہو۔ اور چاہے وہ کھانے کے دوران میں آپ کو پنکھا جھلتی رہے بلکہ پنکھا جھلنے پر تو مریض ہونے کا شبہ پڑنا شروع ہو جاتا ہے بس منہ میں نوالہ ڈلوانے کی کسر رہ گئی۔

اہل مغرب نے بغیر پکائے پکانے کا سا اہتمام پیدا کرنے کی اشد کوشش کی۔ لیکن آخر اصل اصل ہے۔ اصل کی سی بات پیدا نہ ہو

KitaabPoint.blogspot.com

سکی۔ سب سے پہلے انہوں نے کھانے کا کمرہ علیحدہ کر دیا تا کہ اٹھ کر جانا پڑے پھر میز کرسیاں میز پوش کانٹے' چھریاں' چمچیں اور نہ جانے کیا کیا چیزیں چلا دیں پھر کشتیوں سے نکال نکال پلیٹ پر کاٹ کاٹ کر کھانا۔ یہ سب خود ساختہ اہتمام نہیں تو کیا ہے اور پھر اہتمام در اہتمام پیدا کرنے کے لیے دوران خورد نوش کرنا ضروری قرار دے دیا اور عورتوں نے خوبصورت حرکات کی مشق کر کے میز پر ان کی نمائش سے نگاہوں کو مدعو کرنا شروع کر دیا لیکن یہ اہتمام پیدا کرنے کے لیے اتنے لوگوں اور اسلحہ کی ضرورت پڑتی ہے گلی گلی پھر کر لوگوں کو اکٹھا کیا جائے جن میں عورتوں کا ہونا ضروری ہے۔ اک مصیبت ہے پاکستانی ایک آنسو میں غم درد کہہ دینے کے فن میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں ایک دن آپ پکا کر کھایئے اور دیکھیے اس عظیم الشان عمل میں صرف ایک فرد کی ضرورت پڑتی ہے اور معاً آپ کے دل میں فرد کی عظمت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور اہتمام....... اہتمام کی تو انتہا نہیں رہتی۔

ویسے تو پکا کر کھانے کے دوران آپ پر کئی حقیقتیں آ کار ہوں گی لیکن سب سے پہلے حقیقت لکڑیوں کے متعلق ہو گی۔ آپ پر انکشاف ہو گا کہ لکڑی وہ چیز ہے جسے ہر وقت آگ لگ جانے کا خطرہ ہوتا ہے بشرطیکہ آپ اسے جلانے کی کوشش نہ کریں۔ آپ نے کوشش شروع کی تو آپ پر واضح ہونا شروع ہوا کہ آگ جلانے کے لیے صرف لکڑی اور دیا سلائی کافی نہیں بلکہ اور چیزوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً تیل کے جلنے میں قطعی شک نہیں۔ وہ فوراً جل جائے گا لیکن ضروری نہیں کہ جلا بھی دے۔ آپ پر مزید انکشاف ہو گا کہ جل جانا اور بات ہے اور جلتے رہنا اور آگ اسے کہتے ہیں جو صرف جل ہی نہ اٹھے بلکہ جلتی رہے۔ آپ کو پکانے کے عمل کے آخر تک اس بات کو دھیان میں رکھنا پڑے گا یعنی بالکل بیوی کی طرح جسے لے آنا تو آسان ہے مگر رکھنا مشکل ہے۔

اتنی دیر آپ آگ جلانے میں لگے رہتے ہیں کہ آپ کو کسی اور بات کا ہوش نہیں رہتا۔ آپ بالکل بھول جاتے ہیں کہ آگ جلا کر کچھ کرنا ہے۔ بلکہ آپ سمجھنے لگتے ہیں کہ آگ جلانا بذات خود ایک شغل ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی اور شغل کی ضرورت نہیں رہتی مثلاً آپ پڑھ رہے ہیں اور آپ کو احساس ہوا کہ سامنے سے ایک حسین لڑکی گزر رہی ہے چاہے اس وقت برٹرنڈ رسل بڑے کام کی بات بتا رہا ہو یا لی کاک کوئی قہقہہ خیز بات پیدا کر رہا ہو آپ بلا تامل منہ اٹھا کر سامنے دیکھنے لگیں گے لیکن آگ جلاتے ہوئے یہ بات نہ ہو سکے گی گزر رہی ہے تو پڑی گزرے اور آپ پسینہ پونچھ کر چولہے میں پھونکیں مارنا شروع کر دیں گے۔ ضمنی طور پر آپ کے اخلاق کا تحفظ بھی ہو جائے گا اور محلے کا امن بھی قائم رہے گا۔

آگ جلتے ہی معاً جملہ چیزوں کی ضرورت پڑ جائے گی۔ اور آپ اک افراتفری میں پڑ جائیں گے دیگچی اٹھانے کے لیے دوڑیں گے لیکن کیا دیکھیں گے آپ کہ رات بھر چوہوں کے صاف کرنے کے باوجود اس میں کل کے کھانے کا بچا کھچا پڑا ہے۔ اب

KitaabPoint.blogspot.com

آپ نے اسے جلد از جلد کھنگلا کر اور یہ سوچ کر چولہے پر رکھ دیا کہ آگ بذات خود سب سے بڑی جراثیم کش ہے اور گھی ڈال کر اطمینان سے ٹماٹر کاٹنے لگے لیکن ادھر چناخ پٹاخ کر کے جلنے لگا آپ اس قدر گھبرائے کہ ٹماٹر کے ساتھ انگلی کاٹ دی اور آپ لوٹا لے کر بھاگے شکر ہے بجھ گئی لیکن .... ارے یہ تو بجلی بھی بجھ گئی۔ پھنکھا کہاں ہے پنکھا' جیسے ڈوبتا ہے تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے لیکن پھنکھا نہ جانے کہیں گم جایا کرتا ہے' بہت بری عادت ہے پنکھے کی حتیٰ کہ آپ ٹرنک کھول کھول کر دیکھتے ہیں۔مل جائے تو یہ اہتمام ازسرنو شروع ہو جاتا ہے۔

چیزوں کے ادھر ادھر ہو جانے کے بارے میں میں نے بہت غور کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ چیزوں کے سنبھالنے کے دو طریقے ہیں ایک تو انہیں سنبھال کر رکھا جائے اور دوسرے انہیں اجازت دی جائے کہ وہ آپ کو سنبھال کر رکھیں۔ پہلا طریقہ تو مدت مدید سے ناقص ثابت ہو چکا ہے چونکہ سنبھالنے کے درجے ہیں۔مثلاً آپ ایک چیز ذرا زیادہ سنبھال کر رکھ دیتے ہیں حتیٰ کہ ضرورت پڑ جائے تو بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔اس لئے نہیں کہ وہ ادھر ادھر ہو گئی ہے بلکہ اس لئے کچھ زیادہ ہی سنبھالی گئی ہے اس کے علاوہ اس طریقے میں صندوق تالے الماریاں اور جملہ سامان کی ضرورت پڑتی ہے۔میں دوسرے طریقے کو بہتر سمجھتا ہوں چونکہ بارہا آزمانے کے بعد اسے بہت کارآمد پایا ہے یعنی چیزوں کو ادھر ادھر پھینک کر پھیلا دو۔اس میں فقط ایک بڑی سی چٹائی کی ضرورت پڑتی ہے اور صرف ایک کمرے کی آپ بیٹھے بیٹھے چاروں طرف دیکھتے ہیں۔وہ چاقو ہے مکھن دانی کے پاس ڈکشنری کے اوپر پنکھا یہ رہا فلیٹ فٹ کے پاؤں تلے' مربے کے مرتبان' علاوہ ازیں اس طریقے کو برتنے سے آپ احتیاط سے چلنا سیکھ جائیں گے اور احتیاط سے چلنا بڑی خوبی ہے اپنے کمرے میں ڈگ ڈگ چلنا گویا کمرہ نہ ہوا پریڈ گراؤنڈ ہوئی۔

میرا تجربہ ہے کہ پکانے کے وقت کمرے سے زینہ زیادہ کارآمد رہتا ہے۔سب سے پہلے میں ان چیزوں کو اکٹھا کر لیتا ہوں جنہیں گم ہو جانے کی بڑی عادت ہے مثلاً چاقو' چمچ' پنکھا وغیرہ اور انہیں سیڑھیوں پر رکھ دیتا ہوں۔اس پر انگیٹھی سے اوپر حمام نیچے نل تلے بالٹی اور باقی ضروریات' اس طریقہ میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ چیزیں درجہ بدرجہ پڑی رہتی ہیں اور آپ خود پولیس کی طرح چاق وچوبند کھڑے رہتے ہیں آپ کو چاقو کی ضرورت پڑی ایک نظر دوڑائی وہ رہا چاقو' آپ گلیور بن جاتے ہیں اور جملہ سامان آپ کی آنکھ تلے باشتیوں کی طرح آپ کی زد میں رہتا ہے اور آپ کی دست درازی کی کچھ انتہا نہیں رہتی۔

روٹی پکانے کے متعلق میں آپ کو مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ آٹا پڑوسن سے گندھوا لیا کریں۔اس میں کئی ایک فائدے ہیں۔ایک تو آٹا گندھ جایا کرے گا اور دوسرے پڑوسیوں سے راہ رسم پیدا ہو گی جو بسا اوقات بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے کئی اصحاب اس خیال پر

KitaabPoint.blogspot.com

کہ پڑوسیوں سے چھوٹے موٹے کام کروانے سے ان پر واضح ہو جاتا ہے کہ آپ بھی انسان ہیں۔ آپ کو بھی چھوٹی موٹی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے یہ جان کر انہیں آپ کے بارے میں ایسی ایسی باتیں سوچنے کی ضرورت رہے گی کہ آیا آپ کوٹھے پر چڑھ کر جھانکنے کے عادی ہیں یا آپ کو راہ چلتی عورت کے پاؤں دیکھنے کی عادت ہے یعنی صرف آٹا گندھوانے سے آپ ایک شریف پڑوسی بن جائیں گی جو شریف آدمیوں کی طرح پکا کر کھاتا ہے اور جسے شریف آدمیوں کی طرح آٹا گوندھنا نہیں آتا۔ صرف آٹا گندھوانا ہی نہیں اور کام بھی کروا سکتے ہیں آپ مثلاً سوئی اور تاگا بھجوا دیجئے "مہربانی کر کے ذرا اسے پرو دیجئے" پھر دیکھئے کس قدر عزت ہوتی ہے آپ کی ایک تو پرو دیا ہوا تاگا مل جائے گا دوسرے گھر قریب ہے تو رنگین قہقہے مفت اور تیسرے لیکن تیسری بات کو چھوڑیئے شاید آپ کو تیسری بات میں کوئی دلچسپی نہیں بہر حال یہ دو باتیں بھی تو کچھ کم نہیں۔

میرے ایک دوست نے ایک ریکارڈ اور سوئیوں کا ایک بکس خریدنے سے ابتدا کی تھی بس جہاں گراموفون بجنے کی آواز آئی یک سوئی اٹھا وہ ریکارڈ بغل میں داب وہاں پہنچ جاتا جی تکلیف نہ ہو تو ذرا یہ ریکارڈ بجا کر سنا دیجئے بہت بہت شکریہ چند دنوں میں محلے بھر میں چرچا ہو اب گیا...... اب وہ میونسپل کمشنر ہے۔

میرا ایک اور دوست اس فن میں کمال رکھتا ہے فرض کیجئے وہ آپ کے پڑوس میں آبستا ہے لیکن اللہ نہ کرے وہ وہاں آبسے ورنہ کئی ایک دلچسپیوں کے علاوہ کئی ایک مشکلات بھی پیدا ہو جائیں گی۔ خیر تو پہلے دن وہ پوچھے گا جی اگر تکلیف نہ ہو بتا دیجئے کہ چاول ابالنے ہوں تو آیا چاولوں میں پانی ڈالنا چاہیے یا پانی میں چاول...... نتیجہ یہ ہو گا کہ چند ایک دن کے بعد پڑوسن چاول پکانا سکھانے کے لیے خود آ موجود ہو گی اور آپ جانتے ہیں جس گھر میں عورت آ جائے وہ آباد نہیں ہوتا تو ویران بھی نہیں رہتا۔

روٹی بنانا تو کچھ مشکل نہیں آٹے کے پیڑے کو ذرا چوڑا کر کے تھام رکھئے آپ دیکھیں گے کہ وہ لٹکتی جا رہی ہے جب کافی لمبی ہو جائے تو دوسری طرف سے تھام لیجئے اور انتظار کیجئے حتیٰ کہ گول ہو جائے۔ پس فوراً توے پر ڈال دیجئے۔ لیکن خود پکانے کے پہلے دن ہی آپ پر واضح ہو جائے گا کہ روٹی گول نہ ہو تو بھی کھائی جا سکتی ہے اور ذائقہ میں وہ کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی پھر آپ تفریحاً ہر وضع کی روٹی بنانے میں دلچسپی لیں گے اور آخر کار اس امر کی تحقیق شروع کر دیں گے کہ روٹی کی ہیئت میں امکانات کس حد تک ہیں۔

اس بارے میں میری تحقیق بے حد کامیاب رہی ہے حتیٰ کہ یاتھے گارس تھیورم تک بڑی صحت سے آٹے میں اتر آیا۔

چولہے پر رکھے ہوئے توے کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جلا دیتا ہے اس لئے اسے انگلی سے چھونا نہ چاہیے شاید یہ درست ہو لیکن بلا تامل اس پر روٹی ڈال دیجئے اور اطمینان سے کسی کام میں لگ جائیے کوئی حرج نہ ہو گا چونکہ جلانا اور پکانا مختلف چیزیں ہیں۔

KitaabPoint.blogspot.com

اس طرح آپ پکانے کے دوران میں مطالعہ بھی کر سکتے ہیں لیکن کئی لوگ اسے پسند نہیں کرتے۔ چنداں مضائقہ نہیں جلد ہی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ گھی لگا ہو تو آگ لوں کام کرتی ہے جیسے گڑ لگا ہو تو چیونٹیاں اور اس لئے کہ روٹی پک جائے گھی لگانا ضروری ہو جائے گا اور پھر جب کھانے بیٹھیں گے تو کیا دیکھیں گے کہ آپ پراٹھا کھا رہے ہیں اور آپ اس توے کو دعائیں دیں گے جو گھی لگے بغیر روٹی نہیں پکاتا۔

اس کے بعد کھانے کی بات آ گئی لیکن میرا تجربہ مختلف ہے میں پکانے کھانے کو دو مختلف کام نہیں سمجھتا پہلی روٹی اتری اور میں کھانے بیٹھ گیا اس طرح پکانا کھانا ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور آپ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ کہاں پکانا ختم ہوا اور کھانا شروع۔ ایک آنکھ توے کی روٹی پر ہے اور دوسرے اس پیڑے پر جو آپ کے ہاتھوں کا منتظر ہے اور منہ میں وہ کمبخت آلو جو ٹھنڈا ہونے میں نہیں آتا۔

لوگوں نے پکانا اور کھانا علیحدہ علیحدہ کر کے غلط فہمیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس طرح سبب اور نتیجہ بچھڑ گئے ہیں۔ اور خدا مخلوق سے بیگانہ ہو گیا ہے اور تصوف بعد از قیاس۔

پکا کر کھانے کے بعد آپ کو غصہ آ جائے گا کہ کھانے کا عمل ایسی جلدی کیوں ختم ہو گیا ایسے عظیم الشان دیباچے کے بعد ایسی مختصر کتاب۔

پکی پکائی کھانے کے زمانے میں مجھے اس بات پر غصہ آتا ہے کہ پکانے میں اتنی دیر کیوں لگتی ہے۔ فضول وقت ضائع ہوتا ہے اور وقت کی قدر کرنا میری عادت ہے۔ وقت چاہے کام آئے یا نہ آئے لیکن ضائع نہ ہو۔ اس لئے مجھ پر لازم ہو جاتا ہے کہ چار نوالے اٹھاؤں' پانی کا گلاس پی اٹھ بیٹھوں تاکہ صاف ظاہر ہو کہ میں وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن پکا کر کھانے میں یہ احساس نہیں ہوتا کہ پکنے میں اتنی دیر کیوں لگی بلکہ اس بات پر غصہ آتا ہے کہ کھانا اتنی جلدی کیوں ختم ہو گیا۔ جسے اتنا وقت لگا کر تیار کیا جائے وہ اتنی جلدی ختم ہو جائے۔ یعنی تیار کرنے میں جو وقت لگا ہو ضائع ہو گیا۔ اور وقت ضائع کرنا گوارا نہ ہوا اس لئے میں دیر تک چٹخارے لے لے کر کھاتا ہوں۔ علاوہ چبا چبا کر اور زیادہ کھایا جا سکتا ہے اور وہ بھی اینو یا کسی فروٹ سلاد کی مدد کے بغیر۔ علاوہ ازیں کھانے میں کسی قسم کا نقص ہونا قطعی ناممکن ہو جاتا ہے کیونکہ آپ خود جانتے ہیں کہ آپ کیا کھا رہے ہیں اگرچہ دیکھنے میں شلغم نظر آئیں مگر آپ دھوکا نہیں کھا سکتے چونکہ آپ قسم کھا سکتے ہیں کہ وہ شلغم نہیں آلو ہیں۔

پکانے کی جملہ خوبیوں کو جانتے ہوئے ہندوستانی عورتوں نے اسے اپنا کر ہمیں اس سے محروم کر رکھا ہے اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ

KitaabPoint.blogspot.com

لڑکیاں گیلی ہیں۔ چاقو کاٹتا نہیں مولیاں پکی ہوئی ہیں تاکہ ہم پر ظاہر ہو کر پکانے میں مشکلات ہی مشکلات ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ مرد کھانے والی جنس ہے اور عورت کھلانے والی۔ اگر خدانخواستہ وہ کھانا شروع کر دے تو یقیناً آپ کو ایک سمجھدار حکیم کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت لاحق ہو گی۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ کھلانے کا اثر پیدا نہیں کیا جا سکتا جب تک پکا کر کھلایا نہ جائے اگرچہ مغربی عورتوں نے پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ گلاب جامن چکھئے خوب ہیں۔ آپ نے نلکین مچھلی کی طرف توجہ نہیں کی۔ لیکن بات پیدا نہ ہوئی کیونکہ مردوں کی توجہ تو جہ دلانے والی کی طرف مبذول ہو جات اور کھانے کی بات پس پشت پڑ جاتی لیکن پاکستانی مرد کھاتے ہوئے مچھلی کی طرف توجہ دینے کو ترجیح دیتا ہے۔ شاید اسی لئے پاکستان کی عورت پکا کر کھلانے پر مصر ہے۔

پکانے کی بات چھوڑیئے آپ بسکٹوں کا ڈبہ خرید کر لاتے ہیں۔ وہ آپ کو ڈبے میں کھانے کی اجازت نہ دے گی بلکہ ڈبہ اٹھا کر اندر لے جائے گی اور کچھ دیر انتظار کروانے کے بعد چند ایک پلیٹ میں ڈال کر یوں لے آئے گی جیسے اپنی الماری میں سے نکال کر لائی ہو اس ڈبے میں سے نہیں جو آپ خرید کر لائے تھے حتیٰ کہ آپ خود سمجھنے لگیں گے کہ وہ آپ کو کھلا رہی ہے اور وہ نہ ہو تو آپ بھوکوں مر جائیں۔

پکانے کو یوں اپنا کر کھلانے کی لذت حاصل کرنا عورت کی غلطی ہے چونکہ وہ نہیں جانتی کہ یہ خسارے کا سودا ہے وہ پکانے میں لگی ہوتی ہے اور آپ انتظار میں پھر آپ سوچنا شروع کر دیتے ہیں اتنی سی چیز تیار کرنے میں اتنی دیر اور دیکھو کاٹتے ہوئے منہ باتی ہے۔ لاحول ولا قوۃ کس قدر وہقانیت ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ پکانے کا کام آپ کو سونپ دے تو جب آپ پکانے سے فارغ ہو کر آنکھ اٹھائیں تو کیا دیکھیں گے کہ وہ بھی ہے اور وہ آپ کی بیوی ہے اور آپ کی منتظر بھی۔ اس طرح ہر کھانا پکانے کے بعد آپ پر ایک نئی بیوی آشکار ہو نہ آپ سوچیں اور نہ وہ کاٹتے ہئے منہ بنائے اور نہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہ کر عام ہو۔

◆◆◆